NTA-NET/JRF

II Paper

نئے نصاب کے عین مطابق اپنی نوعیت کی منفرد اور پہلی کتاب

ضیائے اردو

ضیاء المصطفیٰ مصباحی

ناشر

آسی بک سینٹر، سیوان

Unit-8

غیرافسانوی نثر

سوانح نگاری کا فن

- 'سوانح' سانحہ کی جمع ہے اور سانحہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ظاہر ہونے والا، پیش آنے والا، وقوعہ اور ماجرا کے ہیں۔
- عام استعمال میں ناپسندیدہ اور وحشت انگیز واقعہ کو سانحہ کہا جاتا ہے۔
- یاد رہے کہ سوانح عمری اور سوانح نگاری کی اصطلاحات میں اس سے لغوی معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس طرح سوانح عمری کا مطلب ہے واقعات اور حیات حالات زندگی یا زندگی کی سرگذشت جس میں اچھے برے نرم گرم، تلخ وشیریں ہر طرح کے واقعات شامل ہیں۔
- سوانح نگاری سے مراد کسی شخص کی سوانح عمری، سرگزشت یا حالاتِ زندگی تحریر کرنے کا نام ہے۔
- انگریزی ادب میں ڈرائیڈن پہلا ادیب ہے جس نے 1683ء میں پہلی مرتبہ 'سوانح عمری' کی تعریف کی تھی۔
- ڈرائیڈن کے مطابق ''کسی خاص شخص کی زندگی کی تاریخ سوانح عمری ہے۔''
- جانسن کے مطابق ''سوانح عمری بیانیہ تحریر کی مختلف اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد پر اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔
- گیان چند جین کے مطابق اس (سوانح) میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیات کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔
- سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔
- سوانح نگاری میں موضوع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔
- سوانح کا موضوع انسان ہوتا ہے۔
- ماہرین نے سوانح نگاری کی ادبی اہمیت کو متعین کرنے کے لیے اس کے تین لوازم کی نشاندہی کی ہے: (1) موضوع (2) مواد (3) اسلوب
- فنی اعتبار سے سوانح میں ایک طرف مداحی خواہ وہ کتنی ہی مدلل اور مربوط کیوں نہ ہو سوانح کو بے جان بناتی ہے۔
- جانسن کہتا ہے کہ سوانح نگار کو سچائی، وضاحت اور نفسیاتی کیفیات پر توجہ دینا چاہیے۔
- حالی کے نزدیک سوانح نگاری ایک افادی صنف ادب ہے جو اصلاح اور اخلاقی مقاصد کے تابع ہے۔

- حالی کے مطابق سوانح عمری تازیانہ عبرت ہے۔ اس سے سوئی ہوئی پسماندہ قوم کی رگ حمیت بیدار ہوتی ہے۔ اس سے نیکی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اچھائی برائی میں تمیز ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ بڑے بڑے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

سوانح نگاری کا آغاز وارتقا

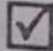
- اردو میں سوانح نگاری کے کچھ دھندلے دھندلے سے خدوخال جنھیں اس صنف کے اولین نقوش کہا جاسکتا ہے دکنی مثنویوں اور اردو شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔
- اردو میں سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے۔
- حالی کو اردو کا پہلا جدید سوانح نگار قرار دیا جاتا ہے اور ان کی تصنیف حیات سعدی 1886ء کو پہلی سوانح۔

حالی اور شبلی کے عہد میں اردو سوانح نگاری

- حالی:* حیات سعدی 1886ء * یادگار غالب 97-1896ء * حیاتِ جاوید 1901ء * المامون 1889ء * سیرت النعمان 1891ء * الفاروق 1898ء * الغزالی 1902ء * سوانح مولانا روم 1906ء * سیرت النبی 1910ء (پہلی جلد)
- مرزا حیرت دہلوی:* سیرت محمدیہ * نورتن اکبری مع سوانح اکبر * نور جہاں بیگم * زیب النسا بیگم * فردوسی * ارسطو اور افلاطون * حیات طیبہ * حیات حمیدیہ
- عبدالرزاق کانپوری:* البرامکہ
- احمد حسین الہ آبادی:* حیاتِ سعدی * حیات نورالدین مخمور * حیاتِ ذوق * حیات سلطان صلاح الدین
- منشی محمد دین فوق:......
- ڈپٹی نذیر احمد:* امہات الامۃ
- افتخار عالم:* حیات النذیر 1912ء
- قاضی محمد سلیمان منصور پوری:* رحمۃ اللعالمین
- افضل حسین ثابت:* حیات دبیر

عہد حالی اور شبلی کے بعد اردو میں سوانح نگاری

- **سید سلیمان ندوی:** * رحمت عالم * حیات امام مالک * سیرت عائشہ * حیات شبلی * سیرت النبی (آخری چار جلدیں) * عمر خیام
- **عبدالسلام ندوی:** * فقرائے اسلام * سیرت عمر بن عبدالعزیز * اقبال کامل * امام رازی
- **حبیب الرحمٰن خان شیروانی:** * ذکر جمیل * نابینائے علمائے سلف * تذکرۂ بابر * سیرت الصدیق
- **مولوی اکرام اللہ ندوی:** * وقار حیات
- **رئیس احمد جعفری:** * سیرت محمد علی * رند پارسا * حیات محمد علی جناح
- **غلام رسول مہر:** * غالب * سیرت سید احمد شہید
- **شیخ محمد اکرام:** * شبلی نامہ * غالب نامہ
- **مالک رام:** * ذکر غالب 1938
- **قاضی عبدالغفار:** * آثار جمال الدین افغانی * آثار ابوالکلام
- **صالحہ عابد حسین:** * یادگار حالی
- **عبدالماجد دریابادی:** * حکیم الامت * محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق
- **عبدالمجید سالک:** * ذکر اقبال
- **ابو سعید قریشی:** * منٹو
- **ملا واحدی:** * سوانح عمری خواجہ حسن نظامی
- **معین الدین ندوی:** * حیات سلیمان



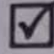
اردو کے اہم سوانح نگاروں کی سوانح عمری

الطاف حسین حالی کی لکھی ہوئی داخل نصاب سوانح

حیات جاوید

- حیات جاوید الطاف حسین حالی کی لکھی ہوئی سر سید کی مفصل سوانح عمری ہے۔ جو پہلی بار 1901 میں نامی پریس کان پور سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔
- حیات جاوید (1901) سوانح نگاری میں حالی کا شاہ کار ہے۔
- حالی نے مقدمہ شعر وشاعری کے 1893 میں شائع ہونے کے بعد ہی سے حیات جاوید لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن 1894 سے اس پر پوری توجہ دی تھی۔
- حالی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔
- حیات جاوید حالی کی تیسری سوانحی تصنیف ہے۔
- حالی نے اپنے پہلے طریقۂ کار کے مطابق حیات جاوید کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
- پہلے حصے میں ولادت، خاندان، بچپن، تعلیم، عنفوان شباب، ابتدائی تصانیف، سرکار انگریز کی ملازمت، غدر اور ان کی خدمات، جدو جہد، مسائل، رسالۂ بغاوت ہند، سائنٹفک سوسائٹی، اردو زبان کی حمایت، سفر لندن، سی آئی آئی کا خطاب، تہذیب الاخلاق، کالج کا افتتاح، تفسیر قرآن، ایجوکیشنل کانفرنس، انڈین نیشنل کانگریس، پارلیمنٹ میں تقریر اور وفات کی سرخیاں قائم کر کے سارے حالات بیان کر دیے ہیں۔
- دوسرا حصہ سر سید کی ترقی کے اسباب کا جائزہ لیتا ہے۔
- حیات جاوید میں حالی نے سر سید کی نجی اور عوامی زندگی کے تمام پہلوؤں اور واقعات کو بیان کیا ہے۔
- حالی نے سوانح نگاری کے مغربی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے موضوع کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں خاندان، معاشرت، ماحول، ماں کی تربیت وغیرہ کے علاوہ دوسرے اثرات کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔

- حالی نے اپنے موضوع کی کمزوریوں کے بیان کے ساتھ ان کی تاویلات بھی پیش کیے ہیں جو سوانح نگاری کے اصول کے خلاف ہے۔
- شاید اسی وجہ سے شبلی نے حیات جاوید کو سرسید احمد خاں کی ''مدلل مداحی'' کہا ہے۔



شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی داخل نصاب سوانح

الفاروق

- ''الفاروق''، شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی خلیفۂ ثانی سیدنا عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری ہے جو پہلی بار 1898 میں شائع ہوئی تھی۔
- الفاروق شبلی کی سب سے زیادہ مقبول تصنیف ہے جسے تاریخ نگاری کا شاہ کار کہا جاتا ہے۔
- شبلی نے الفاروق کے دیباچہ میں اپنے تمام نظریات تاریخ کو جمع کر دیا ہے۔
- شبلی نے الفاروق لکھنے سے پہلے مواد کی فراہمی کے لیے روم اور شام کا سفر کیا تھا۔
- الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے۔
- پہلے حصے میں فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح، خلافت وفتوحات کی تفصیل مستند کتب سے اخذ کر کے لکھی گئی ہے۔
- دوسرے حصے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا جائزہ لے کر ان کے نظام حکومت، ملک کی تقسیم، صیغۂ محاصل، صیغۂ عدالت، فوج داری، بیت المال، صیغۂ فوج، صیغۂ مذہبی، صیغۂ تعلیم، ذمی رعایا کے حقوق، غلامی کے انسداد کی کوشش، سیاست وتدبیر، عدل وانصاف، امات واجتہاد، ذاتی حالات اور اخلاق وعادات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کا فن

- کسی شخص کی سوانح عمری لکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات یا آپ بیتی خود لکھے اسے خودنوشت کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی زندگی کے حالات کوئی دوسرا شخص لکھے اسے سوانح نگاری کہا جاتا ہے۔
- بالفظ دیگر سوانح نگاری کسی ایک شخص کی سیرت، شخصیت اور اس کے واقعات حیات کو کسی دوسرے شخص کے ذریعے معرض تحریر میں لانے کا نام ہے جب کہ خودنوشت سوانح نگاری میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات خود بیان کرتا ہے۔
- بقول وہاج الدین علوی خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے۔ جس کے آئینے میں اس فرد کی داخلی وخارجی زندگی کا عکس براہِ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔
- سوانحی تکمیل کے لحاظ سے خودنوشت سوانح عمری کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں: (1) مکمل خودنوشت (2) نامکمل خودنوشت
- ایک اچھی خودنوشت میں درج ذیل عناصر کا ہونا ضروری ہے:

(1) خودنوشت کسی فرد واحد کی داستان ہوتی ہے جسے اس نے خود اپنے قلم سے تحریر کیا ہو۔

(2) خودنوشت سوانح نگاری کا محور مصنف کی ذات ہوتی ہے۔ دوسرے اشخاص یا واقعات کا ذکر محض ذیلی اور ضمنی طور پر ہوتا ہے۔

(3) خودنوشت سوانح میں سچائی کا عنصر ہوتا ہے۔

(4) خودنوشت میں اس فرد واحد کے تجربات، مشاہدات اور جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیات کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔

(5) خودنوشت سوانح زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے یعنی اس میں صاحب سوانح کی اپنی زندگی کے ہر دور کے نمائندہ واقعات ہوتے ہیں۔ اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے نیز اس کے عروج وزوال اور نشاط وغم کی داستان ہوتی ہے۔

(6) خودنوشت کا فن ایک انتخابی فن ہے۔ زندگی کے عریض وبسیط تجربات سے اہم اور نمائندہ نیز نتیجہ خیز واقعات کا انتخاب کر کے انھیں ایک تخلیقی مرقع میں سجایا جاتا ہے۔

اردو خودنوشت سوانح عمری کا آغاز وارتقا

- جعفر تھانیسری اور عبدالغفور نساخ کی خودنوشتوں کو اردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔
- وہاج الدین علوی نے جعفر تھانیسری کی تصنیف تواریخ عجیب (کالا پانی) 1302ھ کو پہلی خودنوشت قرار دیا ہے۔
- ڈاکٹر مظہر مہدی نے عبدالغفور نساخ کی خودنوشت سوانح عمری 87-1886 کو اولیت کا شرف بخشا ہے۔
- معین الدین عقیل نے شہر بانو بیگم کی خودنوشت 'بیتی کہانی' 1885 کو اردو کا اولین خودنوشت سوانح عمری قرار دیا ہے۔
- اردو کی باقاعدہ اورفنِ خودنوشت کے اصولوں کے مطابق لکھی جانے والی خودنوشت سر رضا علی کی تصنیف 'اعمال نامہ' کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اردو کی پہلی مکمل خودنوشت ہے۔

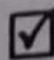
اردو خودنوشت سوانح حیات آزادی سے پہلے

- جعفر تھانیسری: تواریخ عجیب (کالا پانی) 1302ھ
- عبدالغفور نساخ: سوانح عمری 1886ء
- شہر بانو بیگم: بیتی کہانی 1885ء
- ظہیر دہلوی: داستان غدر 1910ء
- خواجہ حسن نظامی: آپ بیتی 1919ء
- سر رضا علی: اعمال نامہ 1942ء
- حکیم احمد شجاع: خون بہا 1942ء
- وزیر سلطان جہاں بیگم: * نیرنگی محبت بملا کماری * ایک ایکٹرس کی آپ بیتی
- چودھری افضل حق: میرا افسانہ 1943ء
- شوکت تھانوی: مابدولت 1945ء
- شورش کاشمیر: پس دیوار زنداں 1947ء

اردو خودنوشت سوانح حیات آزادی کے بعد

- نواب سعید خان چھتاری: یاد ایام 1948ء
- حسین احمد مدنی: نقوشِ حیات 1948ء
- دیوان سنگھ مفتون: ناقابل فراموش 1957ء
- اعجاز حسین: میری دنیا 1965ء
- عبدالمجید سالک: سرگزشت

- یوسف حسین خان: یادوں کی دنیا 1967ء
- ظفر حسین ایبک: آپ بیتی 1964ء
- عبدالغفار مدھولی: ایک طالب علم کی کہانی 1965ء
- عبداللطیف بجنوری: لطیف کی کہانی 1967ء
- جوش ملیح آبادی: یادوں کی بارات 1970ء
- گوپال متل: لاہور کا جو ذکر کیا 1971ء
- رشید احمد صدیقی: آشفتہ بیانی میری 1972ء
- احسان دانش: جہان دانش 1975ء
- خواجہ غلام السدین: مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں 1974ء
- بیگم انیس قدوائی: آزادی کی چھاؤں میں 1974ء
- مشتاق احمد یوسفی: زرگزشت 1976ء
- مرزا ادیب: مٹی کا دریا 1981ء
- عبدالماجد دریابادی: آپ بیتی 1978ء
- مہندر سنگھ بیدی: یادوں کا جشن
- اختر حسین رائے پوری: گردِ راہ 1984ء
- صالحہ عابد حسین: سلسلۂ روز و شب 1984ء
- وزیر آغا: شام کی منڈیر سے 1986ء
- قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ 1987ء
- عبادت بریلوی: یادِ عہدِ رفتہ 1988ء
- مسعود حسین خان: وردِ مسعود 1988ء
- کشور ناہید: بری عورت کی کتھا 1994ء
- اختر الایمان: اس آباد خرابے میں 1995ء
- کلیم عاجز: ابھی سن لو مجھ سے
- انتظار حسین: جستجو کیا ہے؟
- معین احسن جذبی: سچ کہتا ہوں کہ



اردو کے اہم خودنوشت سوانح نگار اور ان کی خودنوشت

اخترالایمان کی داخل نصاب خودنوشت

اس آباد خرابے میں

- اس آباد خرابے میں اخترالایمان کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو ایاز کے رسالہ سوغات میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔
- اخترالایمان کے اس خودنوشت کو پہلی بار ان کے وفات کے بعد دہلی اردو اکادمی نے 1996 میں شائع کیا تھا۔
- اس آباد خرابے میں'' پندرہ ابواب اخترالایمان کے لکھے ہوئے ایک ناقص دیباچے اور سلطانہ ایمان (اخترالایمان کی بیوی) کے لکھے ہوئے مقدمے پر مشتمل ہے۔
- اخترالایمان نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شہریار نے انھیں خودنوشت کو مکمل کرنے کو کہا تھا۔
- اخترالایمان ''اس آباد خرابے میں'' کے ابواب رسالہ سوغات کے مدیر محمود ایاز کے تقاضے پر لکھتے تھے۔
- رسالہ سوغات سال میں دوبار چھپتا تھا۔



مسعود حسین خان

(28 فروری 1919ء-16 اکتوبر 2010ء)

- نام مسعود حسین خان تھا
- مسعود حسین خان 28 فروری 1919ء کو قائم گنج فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔
- مسعود حسین خان کا انتقال 16 اکتوبر 2010ء میں ہوا تھا۔
- مسعود حسین خان نے ابتدائی تعلیم دلی اور پھر ڈھاکہ میں حاصل کی تھی۔
- مسعود حسین نے ایم اے اور پی ایچ ڈی (1945) کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔
- مسعود حسین خان نے لسانیات کی تعلیم پیرس اور لندن میں حاصل کی۔
- مسعود حسین خان نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کیلی فورنیا اور برکلے میں 60-1956 میں کام کیا۔
- مسعود حسین خان نے لسانیات میں ڈی لٹ کی ڈگری پیرس یونیورسٹی سے حاصل کی۔
- مسعود حسین خان علی گڑھ میں اردو کے لکچرر 1943 میں ہوئے۔
- مسعود حسین خان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن نجمہ بیگم سے قائم گنج میں 3 فروری 1948ء میں ہوئی۔
- مسعود حسین خان شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ میں اردو پروفیسر 1962 میں ہوئے۔
- مسعود حسین خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ 1973 میں وائس چانسلر ہوئے۔
- مسعود حسین خاں جامعہ اردو علی گڑھ کے اعزازی وائس چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے پروفیسر ایمریٹس بھی رہے۔
- مسعود حسین خان نے حیدرآباد کے قیام کے دوران 'قدیم اردو' کے نام سے ایک تحقیقی جریدہ جاری کیا تھا جس کا مقصد تھا جدید اصول کی بنیاد پر قدیم متون کی اشاعت
- مسعود حسین خان کے مطابق غزل میں ردیف جھانجھن کا حکم رکھتی ہے۔

اعزاز وخطاب

- مسعود حسین خان کو 1984 میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا۔

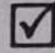
مسعود حسین خان کو امریکہ کی ایسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز کی سینئر فیلوشپ کے اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔

مسعود حسین خاں کے کارنامے

شعری مجموعے: روپ بنگال، (اس کا ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے)۔-دو نیم

دیگر تصانیف: شعر و زبان، اردو زبان و ادب، اردو کا المیہ، اقبال کی نظری و عملی شعریات (اس میں اقبال کی شاعری کا لسانیات کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔)، مقدمہ تاریخ زبان اردو

مسعود حسین خاں کی مرتب کی ہوئی کتابیں: قصہ مہر افروز و دلبر، بکٹ کہانی، عاشورہ نامہ، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، **ورودِ مسعود** (خودنوشت سوانح عمری)



اردو میں مکتوب نگاری کا فن

- مکتوب یا خط دو افراد کے مابین ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے جس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔
- مکتوب عموماً صیغۂ واحد متکلم میں ہوتے ہیں۔ ان میں روزمرہ کی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کا تعلق مکتوب نگار یا مکتوب الیہ کی ذات سے ہوتا ہے۔
- مکتوب میں تمام جاندار اور بے جان اشیا کو موضوع بحث بنایا جا سکتا ہے۔
- ابتدائی دور کے متکوب نہایت پرتکلف ہوتے تھے۔ عبارت مرصع و مسجع ہوتی تھی۔ القاب و آداب میں بے حد مبالغہ ہوتا تھا۔
- مرزا غالب نے خطوط کے روایتی طریقوں کو بدلا تھا اور خطوط نگاری یا مکتوب نگاری کے اصول پیش کیے تھے۔
- مرزا غالب نے لکھا ہے کہ "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے (مکتوب بنام حاتم علی مہر)
- مکتوب کے عموماً مندرجہ ذیل اجزا ہوتے ہیں:
  (1) مکتوب نویس کا نام اور پتہ (2) تاریخ تحریر (3) نشان مجاریہ (4) مقدمہ (5) حوالہ نشان (6) القاب (7) آداب (8) نفس مضمون (9) خاتمہ (10) مکتوب نویس کا دستخط (11) مکتوب الیہ کا نام اور پتہ
- خطوط/مکتوب کئی قسم کے ہوتے ہیں:
  (1) نجی اور ذاتی خطوط (2) دفتری/سرکاری خطوط (3) کاروباری/تجارتی خطوط (4) اخباری خطوط/مراسلے (5) ادیبوں اور دانش وروں کے خطوط

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

- اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی اصناف ادب کی تقلید میں ہوا تھا۔
- پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ "اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط 6/دسمبر 1822ء کا ہے جس کے کاتب والا جاہ بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے حسام الملک بہادر ہیں۔

- اردو کے باقاعدہ پہلے مکتوب نگار مرزا غالب ہیں۔

اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقا

- رجب علی بیگ سرور: انشائے سرور
- غلام غوث بے خبر: *فغان بے خبر *انشائے بے خبر
- غالب: *مہر غالب (مرتبہ عبدالغفور سرور) *انتخاب غالب
*عود ہندی (مرتبہ منشی ممتاز علی خان) *اردوئے معلی (مرتبہ حکیم غلام رضا خان)
*مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی عرشی) *ادبی خطوط غالب (مرتبہ مرزا محمد عسکری)
*خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرساد) *نادرات غالب (مرتبہ آفاق حسین)
*خطوطِ غالب (مرتبہ غلام رسول مہر) *غالب کی نادر تحریریں (مرتبہ خلیق انجم
*غالب کے خطوط (مرتبہ خلیق انجم)
- الطاف حسین حالی: مکاتب حالی (مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی)
- شبلی: *مکاتیب شبلی (مرتبہ سلیمان ندوی) دو جلدیں *خطوط شبلی (محمد امین زبیری اور سید محمد یوسف قیصر
- مہدی افادی: مکاتیب مہدی
- سجاد ظہیر: نقوش زنداں
- سرسید: مکاتیب سرسید
- اقبال: مکاتیب اقبال
- ابوالکلام آزاد: * کاروانِ خیال * نقشِ آزاد * مکاتیب ابوالکلام * تبرکات آزاد * غبار خاطر
- مولوی عبدالحق: مکاتیب عبدالحق
- فراق: من آنم (محمد طفیل مدیر نقوش کے نام لکھے گئے خطوط کے مجموعہ)
- سعادت حسن منٹو: منٹو کے خطوط ندیم کے نام
- فیض احمد فیض: صلیبیں میرے دریچے میں
- پطرس بخاری: پطرس کے خطوط
- صفیہ اختر: زیرلب



اردو کے اہم مکتوب نگار

غالب کا داخل نصاب خطوط کا مجموعہ

اردوے معلیٰ

- اردوے معلیٰ غالب کے خطوط کا مجموعہ ہے۔
- غالب کے اردو خطوط کے مجموعوں میں تاریخی ترتیب کے اعتبار سے اردوے معلیٰ کا نمبر عود ہندی کے بعد آتا ہے۔
- اردوے معلیٰ کا پہلا ایڈیشن غالب کی وفات (2 ذی قعدہ 1285ھ مطابق 10 فروری 1869) کے 19 دن بعد 21 ذی قعدہ 1285ھ مطابق 6 مارچ 1869 کو اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔
- اردوے معلیٰ کا آغاز میر مہدی مجروح کے دیباچے سے ہوتا ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔
- اردوے معلیٰ کے خطوط منشی جوہر سنگھ جوہر کی تحریک اور تقاضے سے جمع کیے گئے ہیں۔
- اردوے معلیٰ کے زیادہ تر خطوط میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع دہلی اور لالہ بہاری لعل نے جمع کیے تھے۔
- اردوے معلیٰ کے خطوط کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں صاف صاف عبارات کے خط رکھے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں مطالب مشکلہ کی تحریریں اور تقریظیں وغیرہ شامل کی گئی ہیں۔
- اردوے معلیٰ کے پہلے ایڈیشن میں صرف حصہ اول ہی شامل تھا۔ دوسرا حصہ دوسرے اڈیشن میں شامل کیا گیا تھا جو ذی الحجہ 1319ھ مطابق اپریل 1899 میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔
- اردوے معلیٰ میں مکتوب الیہم کی مجموعی تعداد 50 اور خطوط کی میزان 472 ہے۔

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

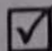
نمبر شمار	مکتوب الیہم	خطوط کی تعداد
1:	نواب میر غلام بابا کے نام	10 خط
2:	منشی میاں داد خاں سیاح کے نام	29 خط
3:	مولوی محمد حبیب اللہ ذکا کے نام	10 خط
4:	منشی ہرگوپال تفتہ کے نام	89 خط

5: شاہزادہ بشیر الدین کے نام — 3 خط
6: سید بدر الدین احمد المعروف بہ فقیر کے نام — 5 خط
7: چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے نام — 16 خط
8: میر سرفراز حسین کے نام — 2 خط
9: میر مہدی مجروح کے نام — 43 خط
10: شاہ عالم کے نام — 2 خط
11: صاحب عالم کے نام — 2 خط
12: مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ کے نام — 1 خط
13: مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام — 1 خط
14: قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام — 12 خط
15: مردان علی خاں رعنا کے نام — 2 خط
16: مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام — 2 خط
17: مولوی عزیز الدین کے نام — 1 خط
18: مفتی سید محمد عباس کے نام — 1 خط
19: عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کے نام — 23 خط
20: حکیم ظہیر الدین احمد کے نام — 1 خط
21: نجم الدین حیدر کے نام (ظہیر الدین کے چچا) — 1 خط
22: نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر وفا کے نام — 5 خط
23: مولوی احمد حسن قنوجی کے نام — 2 خط
24: حکیم سید احمد حسن صاحب مودودی کے نام — 11 خط
25: تفضل حسین کے نام — 1 خط
26: مرزا حاتم علی مہر کے نام — 18 خط
27: منشی نبی بخش حقیر کے نام — 2 خط
28: منشی عبداللطیف کے نام — 1 خط
29: خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام — 14 خط
30: نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کے نام — 1 خط
31: مرزا شہاب الدین احمد خاں کے نام — 7 خط

:32	نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق کے نام	19 خط
:33	میر افضل علی عرف میرن صاحب کے نام	3 خط
:34	مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے نام	2 خط
:35	مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے نام	2 خط
:36	مرزا باقر علی بیگ خاں سالک کے نام	2 خط
:37	ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا کے نام	4 خط
:38	یوسف مرزا کے نام	12 خط
:39	منشی شیونرائن آرام کے نام	33 خط
:40	بابو ہرگوبند سہائے کے نام	2 خط
:41	نواب امین الدین احمد خاں کے نام	6 خط
:42	علاء الدین احمد خاں علائی کے نام	56 خط
:43	مرزا امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کے نام	1 خط
:44	احمد حسین میکش کے نام	2 خط
:45	حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام	1 خط
:46	حکیم غلام رضا خاں کے نام	1 خط
:47	ماسٹر پیارے لال آشوب کے نام	3 خط
:48	جواہر سنگھ جوہر کے نام	2 خط
:49	منشی ہیرا سنگھ کے نام	1 خط
:50	منشی بہاری لال مشتاق کے نام	2 خط

- اردوئے معلّٰی میں خطوط کے بعد مرزا قربان علی بیگ سالک کا لکھا ہوا خاتمہ ہے۔
- خاتمہ کے بعد منشی جواہر سنگھ جوہر کی تاریخ طبع پھر اس کے بعد تصحیح اغلاط کا نقشہ ہے۔
- سب سے آخر میں غالب کا یہ اعلان ہے کہ اس کتاب کا حق تصنیف مصنف نے اپنی زندگی میں حکیم غلام رضا خان صاحب کو بخش دیا ہے۔
- اردوئے معلّٰی کے جمع و ترتیب میں مندرجہ ذیل لوگوں کا اہم حصہ ہے:

(1) غالب (2) غلام غوث بے خبر (3) علاء الدین خاں علائی
(4) میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع (5) لالہ بہاری لعل (6) منشی جواہر سنگھ جوہر۔



ابوالکلام آزاد

(1888ء-1958ء)

- تاریخی نام فیروز بخت، اصلی نام محی الدین احمد، لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔
- ابوالکلام آزاد(مکہ معظّمہ میں 1305ھ مطابق ستمبر 1888ء میں پیدا ہوئے۔
- ابوالکلام آزاد کا انتقال 1958 میں دہلی میں ہوا۔ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیانی میدان میں سپردخاک ہوئے۔(69 سال کی عمر میں)
- ابوالکلام کے والد کا نام مولانا خیرالدین تھا جو دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور دادا کا مولانا محمد ہادی
- ابوالکلام کی والدہ مسماۃ عالیہ، مفتی مدینہ شیخ محمد طاہر وتری کی بھانجی تھیں اور ان کی پیدائش مدینہ میں ہوئی تھی۔
- ابوالکلام کا آبائی وطن دہلی تھا مگر 1897 میں ان کے والد نے مستقل طور پر کلکتہ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔
- ابوالکلام آزاد کے دل میں شاعری کا شوق عبدالواحد سہسرامی نے پیدا کیا تھا۔
- ابوالکلام آزاد شاعری میں امیر مینائی اور داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔
- ابوالکلام آزاد کی پہلی غزل 12 سال کی عمر میں ارمغان فرخ بمبئ میں چھپی تھی۔
- ابوالکلام آزاد نے ایک شاعری کا مجلّہ بنام 'نیرنگ عالم' 1899 میں شائع کیا تھا جو تقریباً آٹھ مہینہ تک چھپتا رہا۔
- ابوالکلام آزاد نے 13 سال کی عمر میں رسالہ 'المصباح' 1900 میں نکالا تھا جو چار مہینے تک چھپتا رہا۔
- ابوالکلام آزاد نے منشی نوبت رائے کا رسالہ 'خدنگ نظر' 1900-1902 اور شبلی کی دعوت پر رسالہ 'الندوہ' 1905-1906 کی ادارت کی تھی۔
- ابوالکلام آزاد نے 20 ستمبر 1903 کو اپنا رسالہ 'لسان الصدق' جاری کیا تھا جس کا آخری نمبر اپریل، مئی 1905 میں چھپا تھا۔
- 1,3 اپریل 1904 کو آزاد نے انجمن حمایت اسلام، لاہور کے اجلاس میں شرکت کی تھی جہاں پہلی بار ان کی ملاقات مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ہوئی تھی جنھوں نے آزاد کا تعارف حالی سے کرایا تھا۔

- ابوالکلام آزاد 1905 کے بعد بنگال کے انقلابی رہنما شیام سندر اور رابندر گوش کی رہنمائی میں انقلابیوں میں شامل ہوئے تھے۔
- آزاد کی ملاقات شبلی سے پہلی بار 1905 میں ہوئی تھی۔
- مولانا آزاد نے دسمبر 1906 میں مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں ڈھاکہ میں شرکت کی تھی۔
- مولانا آزاد کی ملاقات حبیب الرحمٰن خان شیروانی سے 1906 میں اور ابوالکلام آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے 1907 میں ہوئی تھی۔ زلیخا بیگم کی وفات اپریل 1943 میں ہوئی تھی۔
- ابوالکلام آزاد نے تحریک آزادی کو تقویت دینے کے لیے یکے بعد دیگرے الہلال اور البلاغ جاری کیا تھا۔
- مولانا آزاد کے رسالہ 'الہلال' کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912 کو کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ الہلال پر جمال الدین افغانی کے مشہور رسالے عروۃ الوثقیٰ کی بڑی چھاپ ہے۔
- پہلے دور میں 'الہلال' کی آخری اشاعت کی تاریخ 18 نومبر 1914 ہے کیونکہ پریس ایکٹ کے تحت اس کی اشاعت بند کر دی گئی تھی۔
- جون 1927 میں ہلال دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا تھا اور تقریباً 7 مہینے دسمبر 1927 تک نکلا تھا۔
- الہلال کے بند ہونے کے تقریباً ایک سال بعد ابوالکلام آزاد نے البلاغ نکالا تھا۔
- البلاغ کا پہلا شمارہ 12 نومبر 1915 کو نکلا تھا اور آخری شمارہ 3 اپریل 1916 کو
- الہلال اور البلاغ کے ناشر اور منیجر مولوی فضل الدین احمد تھے جو آزاد کے دوست تھے۔
- ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفتہ وار پیغام جاری کیا تھا جو 23 ستمبر سے 16 دسمبر 1921 تک نکلا تھا۔
- میجر ایم سینڈک کا نام ابوالکلام نے چستہ خاں رکھ دیا تھا۔

ابوالکلام آزاد نے فضل الدین احمد کے کہنے پر اپنے خاندانی حالات کو 'تذکرہ' کے نام سے مئی 1916 سے 17 اکتوبر 1916 کے درمیان لکھا تھا۔

- حکومت بنگال نے ابوالکلام آزاد کو 1916 میں جلاوطن کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ رانچی میں 3 سال 9 ماہ نظر بند رہے تھے۔
- مولانا ابوالکلام جمال الدین افغانی کی انقلابی فکر سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔
- مولانا ابوالکلام کے خطوط میں انشائیہ کی جھلک ملتی ہے۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی خیالات سے انگریزی اخبار ''پائنیر'' نے انگریزوں کو باخبر کیا تھا۔

مولانا آزاد کے ایام قید و بند

- رانچی (مورآبادی گاؤں) میں نظربندی 3 سال 9 ماہ۔ رہائی یکم جنوری 1920
- سول ڈس ابودیلنس کے جرم میں قید: ایک سال ایک ماہ (قول فیصل والا بیان اسی گرفتاری پر جاری کیا تھا)
- سائمن کمیشن کی مخالفت میں گرفتاری: پانچ ماہ
- 'ہندوستان چھوڑ دو' (Quit india) تحریک کے الزام میں گرفتاری 9 اگست 1942۔ رہائی 15 جون 1945 3 سال 24 دن۔ احمد نگر قلعہ میں حراست۔
- گرفتاری کی کل مدت تقریباً 9 سال 8 مہینہ، یعنی زندگی کا ساتواں حصہ قید و حراست میں گزرا، جیسا کہ انھوں نے خود غبارِ خاطر میں لکھا ہے ''گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔
- احمد نگر جیل میں جواہر لال نہرو، سید محمود، آصف علی وغیرہ ساتھ میں تھے۔
- ابوالکلام آزاد کے ساتھ جیل میں حافظ علی بہادر بھی تھے۔

ابوالکلام آزاد کے دیگر کارنامے

- اعلان الحق 1903 (پہلی کتاب)
* قول فیصل 1922 (ایک بار حکومت نے بغاوت کا الزام لگایا تو مولانا نے اپنے تحریری بیان میں بڑے فخر کے ساتھ اس جرم کا اعتراف کیا۔ یہی بیان 'قول فیصل' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔)
* خطباتِ آزاد 1940 مرتبہ: نصر اللہ خان
* نوادر ابوالکلام 1962، مرتبہ: عبدالغفار شکیل
* ترجمان القرآن (تین جلدوں میں) اور تیسرے ایڈیشن میں (چار جلدوں میں)
* تذکرہ 1919 (خود نوشت سوانح) فضل الدین احمد کے کہنے پر لکھا تھا۔
* غبارِ خاطر 1946
* کاروانِ خیال (خطوط کا مجموعہ) 1946
* نقش آزاد (مرتبہ غلام رسول مہر) اس میں غالب پر مولانا کی تحریریں بھی ہیں۔

اس میں خطوط اور مضامین ہیں۔
* تبرکاتِ آزاد (مرتبہ غلام رسول مہر) ابوالکلام آزاد کے مقالات کا مجموعہ ہے۔
* انبیائے کرام (مرتبہ: غلام رسول مہر) ابوالکلام آزاد کے کلام اور ان کے ابتدائی مضمون
* ارمغان آزاد (مرتبہ: ابوسلیمان) ابوالکلام آزاد کے کلام اور ان کے ابتدائی مضمون
* آزاد کی تقریریں
* خطبات آزاد
* البیرونی اور جغرافیہ عالم
* ہندوستان پر حملہ اور مسلمانوں کے فرائض
* آزادی ہند (انڈیا ونس فریڈم) کا اردو ترجمہ از رئیس احمد جعفری)
* حیات سرمد
* میرا عقیدہ
* ولادتِ نبوی

ابوالکلام آزاد کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- ابوالکلام آزاد کو 'اردو کا ادیب اعظم' عبدالماجد دریابادی نے کہا تھا۔
- ابوالکلام آزاد کو 'امام الاحرار' کا لقب شائق احمد عثمانی نے دیا تھا۔
- بقول رشید احمد صدیقی ''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔''
- اگر قرآن اردو زبان میں اترتا تو ابوالکلام کی نثر میں اترتا۔ (سجاد انصاری)

ابوالکلام آزاد کا داخل نصاب خطوط کا مجموعہ

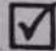
غبارِ خاطر

(مرتب: مالک رام)

- (قلعہ احمد نگر کی اسیری از 9 اگست 1942 تا 15 جون 1945 زمانے کی تحریرات)
- غبار خاطر ابوالکلام آزاد کے 24 خطوط کا وہ مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی اسیری میں 9 اگست 1942 سے 15 جون 1945 کے درمیان صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام لکھے تھے۔
- غبار خاطر کے خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہنچے تھے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے بقول آزاد: ''یہ تمام خطوط نجی خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے۔ لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک

مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں۔''

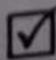
- غبارِ خاطر کو پہلی مرتبہ محمد اجمل خان نے مرتب کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ 1946 میں شائع کیا تھا۔
- غبارِ خاطر کے تمام خطوط میں آزاد نے شیروانی کو 'صدیق مکرم' سے مخاطب کیا ہے۔
- غبارِ خاطر کے خطوط کو ابوالکلام آزاد نے 'پنج کے خطوط' کہا ہے۔
- ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر کا نام غبارِ خاطر رکھنے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی نے ایک رسالہ 'غبارِ خاطر' لکھا تھا میں یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں۔''
- غبارِ خاطر میں حکایت بادۂ تریاک، حکایت زاغ و بلبل، چڑیا چڑے کی کہانی اور داستان بے ستون و کوہ کن کے عنوان سے بھی خطوط ہیں۔
- ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر میں چائے کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے کیونکہ وہ چائے کے بے حد شوقین تھے۔
- ابوالکلام کو وائٹ جاسمین بہت پسند تھی جس کا ترجمہ انھوں نے گوری چنبیلی کیا ہے۔
- غبارِ خاطر کے خطوط میں ابوالکلام آزاد نے سات سو اشعار استعمال کیے ہیں۔
- غبارِ خاطر میں سب سے زیادہ اشعار غالب کے ابوالکلام نے لکھے ہیں۔
- غبارِ خاطر کے دو خطوط میں ابوالکلام آزاد نے خدا کی ہستی پر بھی بحث کی ہے۔



سرسید احمد خان کا داخل نصاب مضامین کا مجموعہ

مضامین سرسید

(1) عزت
(2) ہمدردی
(3) اپنی مدد آپ
(4) بحث وتکرار
(5) عید کا دن
(6) آزادی رائے
(7) انسان کے خیالات
(8) گزرا ہوا زمانہ
(9) اخلاق
(10) خوشامد
(11) تعصب
(12) مہذب قوموں کی پیروی
(13) ترقی علوم
(14) اردو زبان اور اس کی عہد بعہد ترقی
(15) امید کی خوشی
(16) دنیا بہ امید قائم ہے
(17) سراب حیات
(18) ہندو اور مسلمان میں ارتباط
(19) ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا
(20) نیچر



انشائیہ نگاری کا فن

- انشائیہ لفظ انشا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دل سے کوئی بات پیدا کرنا، عبارت آرائی کرنا وغیرہ۔
- انشائیہ میں وہ شخصی خیالات و تاثرات جو کسی بھی چیز سے متعلق ہوں اس انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔
- بلفظ دیگر انشائیہ وہ تحریر ہے جس میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لمحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔
- جانسن نے انشائیہ کو ذہن کی ایک آزاد ترنگ کہا ہے۔
- انشائیہ کی جان یہی ترنگ ہوا کرتی ہے۔ انشائیہ میں یہ ترنگ ہی کی کیفیت ہوتی ہے جو اسے دوسری اصناف ادب سے الگ کرتی ہے۔
- انشائیہ کا سارا حسن اس کی تاثیر اور اس کے شخصی ہونے میں ہے۔
- انشائیہ میں غزل کا سا انداز ہوتا ہے یعنی گہری سے گہری بات خوش گوار انداز میں پیش کی جاتی ہے۔
- انشائیہ کے موجد مونٹین نے انشائیہ کو ذاتی شبیہ سے تعبیر کیا ہے۔
- انشائیہ میں مواد اور ہیئت دونوں پر شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے۔
- انشائیے شخصی جذبات و احساسات اور ذاتی تجربات و مشاہدات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔
- انشائیہ Lyric یا غنائیہ کے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔
- مڈلٹن مرے انشائیہ میں اختصار کے ساتھ عدم تکمیل کو ضروری سمجھتا ہے۔
- انشائیہ نگار کو موضوع کے انتخاب کی آزادی ہوتی ہے۔
- انشائیہ میں کسی خاص ترتیب کے ساتھ خیالات کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔
- جانسن نے انشائیہ کو غیر منظم ادب پارہ کہا ہے۔
- انشائیہ نگار موضوع کے بجائے موڈ (Mood) کا تابع ہوتا ہے۔
- انشائیہ میں شخصی احساسات اور تاثرات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔
- سبھی نقادوں نے انشائیہ کو بے تکلفانہ اور غیر رسمی انداز قرار دیا ہے۔
- بیکن نے انشائیہ کو ایسی مختصری تحریر کہا ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے حقیقت کا اظہار ہو۔
- انشائیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پھوٹ کر اپنا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔

- انشائیہ میں رمزیت اور تہہ داری ہوتی ہے۔
- انشائیہ کی ایک خصوصیت انشائیہ کا مکمل نہ ہونا ہے۔
- انشائیہ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ اپنی سرشت میں اتنا نازک ہوتا ہے کہ کسی قسم کا دباؤ یا بوجھ برداشت نہیں کرتا۔
- بقول جے بی مورٹن انشائیہ نثر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔
- انشائیہ کی تین خصوصیات ہوتی ہیں:
  (1) احساس شعریت (2) وسعت علم (3) حکیمانہ نزاکت خیال

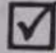
انشائیہ کا آغاز وارتقا

- وجہی کی 'سب رس' میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔
- انشائیہ کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہوتا ہے اور ان کا مضمون 'امید کی خوشی' انشائیہ کے تمام مطالبات کو پورا کرتا ہے۔
- کچھ لوگوں نے محمد حسین آزاد کو باقاعدہ پہلا انشائیہ نگار اور نیرنگِ خیال کے انشائیوں کو انشائیہ کے اوّلین نقوش قرار دیتے ہیں۔
- محمد حسین آزاد کے عہد کو انشائیہ کی صبح کاذب اور رشید احمد صدیقی کے دور کو انشائیہ کی صبح صادق کہا گیا ہے۔

انشائیہ کا ارتقا

- سرسید: *امید کی خوشی
- محمد حسین آزاد: *شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار۔
- عبدالحلیم شرر: *مغرور جوتا *ہمارے شعرا کا معشوق
- حسن نظامی: *مچھر *مکھی *الو *لمپ *مٹی کا تیل *دیا سلائی *اوس *انگلی کا کشف *اینٹ چونے کا وصال *برف *لالٹین *مست الست کی دعا
- سجاد حیدر یلدرم: مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔
- فرحت اللہ بیگ:......
- ابوالکلام آزاد:......
- رشید احمد صدیقی: *ارہر کا کھیت، وکیل صاحب

- مہدی افادی:.......
- پطرس بخاری: * ہاسٹل میں پڑھنا * لاہور کا جغرافیہ * کتے * سنیما کا عشق
- سجاد انصاری:.......
- شوکت تھانوی: * موج تبسم * سودیشی ریل * نمک مرچ * سیش محل *
- ناصر علی دہلوی:.......
- شفیق الرحمٰن: * شگوفے * حماقتیں
- ابراہیم جلیس:.......
- کرشن چندر: ہوائی قلعے
- منٹو:.......
- مشتاق احمد یوسفی: جنون کا لطیفہ
- احمد جمال پاشا: * کپور کا فن * شامت اعمال
- کنہیالال کپور: چینی شاعر
- یوسف ناظم: شاعروں میں ہوٹنگ کے فوائد
- مجتبیٰ حسین: مرزا کی یاد میں



سجاد حیدر یلدرم کا داخل نصاب انشائیہ

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

(ایک مضمون نگار کی شکایت احباب سے)

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دہرادی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا اور جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت تھا۔ مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی، رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہیے، یہ تھی:

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن چلا جاؤں۔ مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو، میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر ان کے قصے کا اثر ہوا ان سے خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں ہوں اور وہ مفت خوری سے

دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے، وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہئے، میں رات دن اسی فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے اور آخر کار میں بظاہر اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں، میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں، اس کا کوئی دوست نہیں۔" اگر یہ سچ ہے تو اسے مبارکباد دینی چاہیے۔"

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں۔ مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:

"بھائی جان دیکھو، پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔" کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آرہے ہیں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے، جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے، کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب دینا پڑتا ہے؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے۔ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہوحق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ کیا اس بات پر بھی شکریہ ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کون سی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں۔ بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں۔ اور میرے خیر طلب ہیں۔ مگر عملی نتیجہ یہ ہے

کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا۔ اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفریں کی جائے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہیں ثابت کر سکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کتنا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے ایک دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں ''کوئی آرہا ہے قیامت نہیں ہے۔'' ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ ''میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں'' تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے! توبہ توبہ!! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے، چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آکے لگا۔ (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:

''اَہاہاہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے، کہو طبیعت تو اچھی ہے، میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ'' یہ کہہ کر وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں!! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم میں انہیں

چھوڑ دوں گا ہاں چھوڑ دوں گا اگر چہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجیے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں، یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں۔ جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔" اگر پالٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ "بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔" اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی؟ کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جب کہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے، میں محمد شاکر صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امرا کے شایان شان ہے، ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کے:

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصے رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کر چلے آنا دیکھو، میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہولیا۔ ایڈیٹر 'معارف' سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون

بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا۔ اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ "ہیں! ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی کام شروع کردو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلیے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کھلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں سرگرداں تھا وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اٹھ کر کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب۔ مگر اکثر میں نب ندارد، جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں۔ مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضروریات کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی اور میرے پراں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغاں خوش نوا کی تعریف میں شعراء اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن، تن تن تننا۔ چھن۔ تان، تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ ہیں! یہ کیا ہے؟ افوہ! اب میں سمجھا میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں:

"اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ آہا مجھ کو صبا سے ہے امید) مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

واہ واہ!! سبحان اللہ! کیا غزل چھڑی ہے۔

"اے ترک سوار نواح عربی یثرب نگری میں پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے۔ وہ حبیب مرا مجھے وا کی کھبر یالا دینا۔"

بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہوگئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لئے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آؤ۔" یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا:

"ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل....."

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا۔ "ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟" ہرگز نہیں، ایسا معمولی تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلی درجے کی تشبیہ تھی۔ اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ:

"اس گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ ہی خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہت زلف بھی لاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہر حال مجھے وہ فقرہ از سر نو درست کرنا چاہئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پر کرنے کے لئے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا۔ لاحول والا قوۃ۔ میں بھی کیا گڑ بڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے آیا ہے۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیے اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوتی ہے

اور بظاہر۔"

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شبن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لیے تشریف لائیے، کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔"

بادل نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر خاں صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ شبن صاحب نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد آئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہزار دقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا۔

"ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح۔ نئی معلومات اور نئی دنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں"

دروازہ پر پھر دستک۔

"کیا ہے؟"

"اچھا۔"

دریافت کرنے کے لیے اپنے خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجود

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔"

"افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں، میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت

مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔'' ''اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسا کر کے۔

''اچھا بھائی لو ابھی آیا۔''

یہ کہہ کر میں کھانے کے لیے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں۔ ''چہرے پر تھکن محسوس ہوتی ہے، کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟''

سوائے اس کے کہ آمنا وصدقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے مجھے رغبت نہیں وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں'' سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کرلو۔''

واپس کمرے میں آ کر تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کرلوں اور پھر لکھنا شروع کردوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ''زندگی اور موت کا لانیخل مسئلہ۔'' اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ ''زندگی اور موت کا لانیخل مسئلہ'' بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے'' آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے۔'' میں سچی بات کہوں گا کہ کچھ بھی نہیں لکھا۔" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آ کر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ ناشکر اور احسان فراموش کہا جاؤں گا۔ مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں ان احباب کی فہرست

ختم ہوگئی جن سے میں رخصت طلب کرسکتا ہوں۔نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں۔مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔مگر جب آتے ہیں میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ایک صاحب جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ایک صاحب ہیں جو مجھ سے ملتے ہی کہتے ہیں"میاں عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہارے دعوت کروں۔" مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ایک دوست آتے ہیں۔وہ آتے ہی سوالات کی بوچھار شروع کردیتے ہیں۔جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہوکر نہیں سنتے،یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ایک صاحب ہیں وہ جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں،مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں

"مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کردیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کردوں۔دروازے پر ایک گاڑی آکے رکی ہے۔میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔میں ان کی شکایت نہیں کرنے کا کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرمانے کرم نہیں فرمایا۔اس لئے اس کے شکریے میں

میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔جب آتے ہیں مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہی کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آیئے۔آیئے۔مزاج عالی بہت دن بعد تشریف لائے۔"

(ملخص)

کنہیالال کپور

(1910ء-1980ء)

- نام کنہیالال کپور
- کنہیالال، لائل پور کے ایک گاؤں میں 1910ء کو پیدا ہوئے۔
- کنہیالال کا انتقال 1980ء کو ہوا۔
- کنہیالال کے والد کا نام ہری لال تھا اور والدہ کا دیوی کپور۔
- کنہیالال کی شادی پشپاوتی سے 1931 میں ہوئی تھی۔
- کنہیالال نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات لاہور سے پاس کیے تھے۔
- کنہیالال نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز پروان کی پیروڈی 'نقفان' کے نام سے لکھ کر کیا تھا۔
- کنہیالال کا موضوع ادب ہے اس لیے وہ عموماً ادبی موضوعات کو طنز وظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔
- کنہیالال ہند سماچار، سنڈے ایڈیشن اور مجھ سے میرے دوستوں کو بچاؤ کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔

اعزاز وانعام

- کنہیالال کپور کو فخر الدین علی احمد نے' غالب ایوارڈ سے 1975 میں نوازا تھا۔

کنہیالال کے کارنامے

* سنگ وخشت 1942 پہلی تصنیف
* چنگ ورباب 1944
* شیشہ وتیشہ 1946
* نوک نشر 1949
* بال وپر 1954
* نرم گرم 1957
* گرد کارواں 1960
* نئے شگوفے 1988
* کامریڈ شیخ چلی

مضامین:

* چینی شاعری 1937
* غالب جدید شعرا کی مجلس میں
* فلسفہ، قناعت
* اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

* انکم ٹیکس والے
* اخبار بینی
* اہل زبان
* سنانے کا مرض
* مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ

خاکے:

* فریادی (کرشن چندر کا خاکہ)
* جہاں گرد (دیویندر ستیارتھی کا خاکہ)

کنہیا لال کپور کے داخل نصاب انشائیے

غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں

[دور جدید شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م ن ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ، میاں رقیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرما جیت ورما، عبدالحی نگاہؔ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں ان کی شکل وصورت بعینہ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں]

غالبؔ: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیئے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب: (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں۔ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد ـــ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.......

تیسرا شاعر: (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے۔

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث؟

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کاروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر: میں کرسی صدارت کے لئے جناب م۔ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ن۔ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے.......

میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب:۔ بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائیگی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ن۔ارشد: معاف کیجئے گا مرزا، اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں۔)

غالب: جی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجئے مرزا، ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

میراجی: دیکھئے نا مرزا آپ فرماتے ہیں؟ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور، سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے

خط لکھیں گے کیوں کہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو۔
جس طرح سے میری اک اک نظم کا۔
کچھ بھی تو مطلب نہیں۔
خط لکھیں گے کیوں کہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیرا جی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں، ہاں۔ بڑے شوق سے۔

ہیرا جی: جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن۔ارشد: ۔اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب: ۔میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔کہا ہے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحیٔ نگاہ: ۔گستاخی معاف مرزا۔اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: ۔کس طرح؟

عبدالحیٔ نگاہ: عشق نے، ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے؟ تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا۔

غالب: (طنزاً) بہت خوب۔بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی

اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب: واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن۔ ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالص؟ جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص:۔ اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اسلیئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ن۔ ارشد:۔ توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے۔ ''بدلہ۔'' عرض کیا ہے۔

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے

جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں۔
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بیکار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تا کہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا

اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کردوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب وسمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیراجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھ اجائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب وتمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں۔)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیرلب مسکراتے ہیں۔)

غالب: ارشد صاحب معاف کیجئے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم، اور ادراک سے بالاتر ہے؟

م۔ن۔ارشد:۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتایئے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگر چہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں۔ مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ارشد:۔ اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص:۔ میری نظم کا عنوان ہے، "عشق"۔ عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا۔
اس نے یوں رو کر کہا۔
عشق اک طوفان ہے

عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ — عشق
عشق ہے پیغام موت

غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے، نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص:۔ (جھنجھلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم۔ نہ قافیہ۔ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل، تازگئ افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب: رفعت تخیل، کیا خوب۔ کیا پرواز ہے

میں نے اک عاشق سے پوچھا، اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص: (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دور جدید کی روح انقلاب، کشمکش تحقیق، تجسس، تعلّی پرستی اور جدو جہد ہے۔

ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے۔ اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب ونیٹی فیر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے، قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا

رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب ولطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ن۔ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک، بیکاری انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن وعشق، گل وبلبل شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کرسکتے۔شاعری کے لئے اور بھی موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا

آج تک سرخ سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی۔ اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ عہد علی خاں: بہت خوب یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے، ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ، ہے۔ جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سنیے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جارہے ہیں خط چہار اطراف کو۔
بمبئی کو، مصر کو لندن کو کوہ قاف کو

دیکھنا، آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا۔ بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے۔)

ن۔م۔ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی: تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی

پروفیسر غیظ: آپ کی مرضی تو وہی سن لیجئے۔ عنوان ہے ''لگائی''

فون پھر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ

تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ وار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں۔)

م۔ن۔ارشد: حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد: (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے) بکواس ہے!

م۔ن ارشد: اب ہیرا جی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیرا جی: میری نظم کا عنوان ہے۔ ''بینگن''

غالب: بینگن؟

ہیرا جی؟ بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب: معاف کیجئے گا، نظم پڑھیے۔

ہیرا جی: عرض کیا ہے:

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو —
کرشن کنہیا ڈھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤ لیکن رادھا پیاری

رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھوکا رہنا بہتر —
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری ہیرا جی کا ہی حصہ ہے۔)

م۔ن۔ارشد: اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب: (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما: مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گیے تھے۔ دور جدید کے شعرا نے انھیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب: جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ میراثی یا اس قماش کے لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت: پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس۔" عرض کیا ہے؛

اڑ جا دیس بدیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب، سن کر تیری کائیں کائیں!

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن ارشد: بھئی۔ کیا اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب۔ میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

بکرماجیت:۔ سنئے پہلا بند ہے؛

بول کبوتر بول!
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے

من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹرغوں بول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا: (ایک زبان ہو کر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سنئے:۔

بول کبوتر بول!
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول!

باقی شعرا: (یک زبان ہو کر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس شور وغل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

چینی شاعری

چینی شاعری پر قلم اٹھانے سے پہلے میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں چینی نہیں جانتا مگر اس بات کا مجھے چنداں افسوس نہیں، کیونکہ اگر میں چینی نہیں جانتا تو آپ کب جانتے ہیں؟ چینی تمدن، چینی لٹریچر، چینی تہذیب سے میری واقفیت صرف دو چیزوں کی وساطت سے ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو کہ چینی کا پیالہ جو میں نے پچھلے سال آل انڈیا نمائش سے خریدا تھا اور دوسری ہے ایک چینی تصویر جس میں ایک چینی شہزادی (میں اسے شہزادی ہی کہوں گا) ایک کتے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ بہر حال آپ کو ان چیزوں سے کیا مطلب؟ آپ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ چین کا سب سے بڑا شاعر کون ہے، اور چین میں اس وقت کتنے شاعر ہیں۔ تو لیجیے چین کا سب س
ے بڑا شاعر شین شے شک ہے اور چین میں اس وقت ہزاروں شاعر ہیں۔ بلا مبالغہ چین کا بچہ

بچہ شعر کہتا اور سمجھتا ہے۔ اگر میں ان تمام شاعروں کے نام لکھ دوں، تو آپ یقیناً حیران ہو جائیں اور اگر میں ان کے مطبوعات کی فہرست بھی شامل کر دوں تو آپ کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہو جائے مگر میرا مقصد آپ کو حیران یا پریشان کرنا نہیں۔ میرا مطلب تو آپ کا چینی شاعری سے تعارف کرانا ہے۔ چینی شاعروں کے نام یاد کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ مجھے یاد ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ ان چھ سات لفظوں کو یاد کر لیں پانگ۔ شانگ۔ ٹانگ۔ شک۔ بک۔ ٹین ۔شین۔ اب انہی لفظوں کے ہیر پھیر اور امتزاج سے چین کے ہر ایک چھوٹے اور بڑے شاعر کا نام بن سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ چین کا سب سے بڑا رومانی شاعر کون ہے؟ تو آپ فوراً کہہ دیجیے ٹین بک بک۔ چین کا سب سے بڑا انقلابی شاعر کون ہے؟ شین ٹانگ ٹانگ۔ اقتصادی شاعر؟ شک ٹین ٹانگ۔ اچھا آپ کی ایک مشکل تو حل ہوئی۔ اب آگے چلیے۔

یقیناً آپ اس بات کے جاننے کے خواہش مند ہیں کہ چینی شاعر، کن چیزوں کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور ان کے کلام کی کیا خصوصیات ہیں۔ تو سب سے پہلی بات جو آپ کو سمجھنی چاہیے وہ یہ کہ چینی شاعر عموماً پھولوں، جھیلوں، سمندروں اور سانپوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ مثلاً شین ٹین ٹانگ کو ہی لیجیے۔ اپنے تازہ مجموعہ کلام میں اس نے سوائے سانپوں کے کسی اور چیز کا ذکر تک نہیں کیا، مثال کے طور پر اس نظم کو لیجیے۔

"آہا جھیل کے سنہرے پانی پر سانپ ناچ رہا ہے
کیا دلکش نظارہ ہے
کاش! ہم سب سانپ ہوتے

مگر آپ یہ نہ سمجھئے۔ کہ شین ٹین ٹانگ سوائے سانپوں کے کسی اور چیز پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس نے مینڈکوں، چوہوں اور مچھروں پر بھی لاتعداد نظمیں لکھی ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دوسری بات چینی شاعری کے متعلق یہ ہے کہ چینی شاعر عجیب وغریب استعارے، نادر الوجود ترکیبیں اور نہایت دلکش تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً شین شانگ ایک جگہ لکھتا ہے:

میری محبوبہ کی آنکھیں
سبز ہیں
شفتالو کے پتوں کی طرح
اس کے دانت
تیز ہیں

تلوار کی طرح
اور آندھی کی طرح
اس کے بال سیاہ ہیں
اور قد دیوار چین سے اونچا ہے

آپ نے کالی، نیلی، اور پیلی آنکھیں تو دیکھی اور سنی ہوں گی مگر 'سبز آنکھیں' صرف شین شانگ کے کلام ہی میں پائی جاتی ہیں اور محبوبہ کے دانتوں کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟ جزاک اللہ صاحب، یہ چین ہے چین اور سنئے۔ پانگ پانگ ٹین لکھتی ہیں:

سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں مجھے بے چین کر رہی ہیں
خزاں آگئی
طرح طرح کے پھول کھلے
بلبل گا رہی ہے۔ مگر اُف!
مجھے کس قدر بھوک لگ رہی ہے

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ چین میں یا یوں کہیے، چینی شاعری میں ہر ایک چیز ممکن ہے اور یہی تو چینی شاعری کی خوبی ہے۔ ہمارے یہاں بہار میں پھول کھلتے ہیں مگر چینی شاعروں کا تخیل دیکھیے کہ خزاں میں پھول کھلوا دیئے اور پھر سورج کی ٹھنڈی کرنیں! قلم توڑ کے رکھ دیا ہے۔

چینی شاعر پھولوں کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں۔ ایک شاعر لکھتا ہے

مجھے نیلوفر کے پھول لا دو
اور ہاں، نرگس، چنبیلی اور گلاب بھی
کیا تم نے نہیں سنا
مجھے نیلوفر کے پھول درکار ہیں
کہیں سوسن نہ لے آنا۔ بے وقوف!
مجھے چاہئیں، صرف نرگس، چنبیلی اور گلاب
اچھا۔ ٹھہرو۔ آج مت لانا
مجھے آج زکام ہے

آخری مصرع میں شاعر نے حقیقت نگاری کو جس معراج پر پہنچایا ہے وہ اس کا ہی حصہ ہے۔ کاش! ہمارے نوجوان ہندوستانی شاعر کچھ چینی شاعروں سے سیکھتے۔ ذرا غور فرمایئے۔ شاعر پھول

منگوانا چاہتا ہے مگر یک لخت اس کو خیال آتا ہے کہ اسے زکام ہے پھر پھول منگوانے کا فائدہ ہی کیا۔
''پھر کبھی سہی'' شاعر کہتا ہے۔اور نظم کو اس رنگین مصرع پر کہ'' مجھے آج زکام ہے۔'' ختم کر دیتا۔

اظہارِ عشق میں چینی شاعروں کا کوئی ہم پلہ نہیں وہ دقیق سے دقیق نفسیاتی مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں۔اس طرح کہ بیچارے ہندوستانی شاعر منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔مثلاً شین ٹانگ شک کو لیجیے۔لکھتا ہے۔

کل میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی
میں نے زہر خریدا
میں سمندر کے کنارے پر گیا
میں نے اپنے کپڑوں پر پٹرول ڈالا
میں زہر کی گولی کھا کر
اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر
سمندر میں کود جانا چاہتا تھا
کہ معاً مجھے خیال آیا
کہ وہ مٹھائی جو تمھاری بہن نے تم کو بھیجی تھی
میرے مرنے کے بعد
تم اکیلی ہی کھا جاؤ گی
میں نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا
اور سیدھا گھر چلا آیا

کیوں صاحب! دیکھا آپ نے چینی شاعری کا کمال! شاعر خودکشی پر آمادہ تھا اس نے بیک وقت تین مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

مگر اچانک جب کہ وہ دنیا کی ہر ایک چیز سے کنارہ کشی کر کے زہر کھا کر کپڑوں کو آگ لگا کر سمندر میں کودنا چاہتا تھا۔اسے ایک ایسی چیز یاد آئی، جس نے اس کے دماغ میں عجیب ہیجان پیدا کر دیا۔

مٹھائی! اور پھر اس پر یہ پریشان کن خیال کہ اس کی بیوی اسے اکیلی کھا جائے گی! یہ ہے نفسیاتی شاعری۔

چینی شاعر انسانی دماغ کی عمیق گہرائیوں میں جس خوبی سے اتر سکتا ہے، وہ صرف نفسیات کے

ماہر ہی جان سکتے ہیں۔

اب صرف ایک اور بات آپ کو سمجھ لینی چاہیے اور پھر آپ چینی شاعری کو مکمل طور پر سمجھ جائیں گے۔ وہ بات یہ ہے کہ چینی شاعر بعض دفعہ اپنے شعروں میں اور کئی دفعہ اپنی غزلوں میں ہندوستانی شاعروں کے تخیل کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً پو ہانگ لی ایک جگہ کہتا ہے:

اے میرے محبوب تمھاری گلی میں آنا کس طرح چھوڑ دوں کیونکہ یہ تو ایک عمر بھر کی عادت ہو چکی ہے۔

اب آپ میں سے جنھوں نے کلامِ حالؔی کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ شعر حضرت حالؔی کے مشہور شعر

چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

کا مماثل ہے۔ ایک اور جگہ یہی شاعر لکھتا ہے

''صرف وہی شخص نیند کا لطف اٹھا سکتا ہے جس کے بازوؤں پر تمھاری زلفیں پریشان ہو جاتی ہیں۔''

اب یہ شعر آپ کو غالبؔ کے مشہور شعر

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

کی یاد دلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پو ہانگ لی غالبؔ کی شاعری سے نہایت متأثر ہوا ہے۔ کمبخت ٹانگ ٹانگ نے علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم 'اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو' کا پورا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ لکھتا ہے:

''کہ جس کھیت سے کاشتکار کو روٹی نہیں ملتی اس کے ہر ایک خوشۂ گندم کو جلا دو۔''

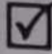
چین کا مشہور شاعر بھک بھک جو کہ شاعر ہونے کے علاوہ ظریف بھی ہے۔ اپنے ملک کے نوجوانوں کی مغرب پرستی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے

''افسوس کہ چین کے نوجوان مغرب کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ مغرب میں تمام برتن بلور کے ہوتے ہیں اور ہمارے ہاں سب چینی کے۔''

غور کیجیے۔ بھک بھک کا تخیل علامہ اقبالؔ کے تخیل کے کس قدر نزدیک پرواز کر رہا ہے۔ جو بات بھک بھک نے آج کہی وہ ہندوستان کے شاعر نے بیس برس پہلے ہمارے ذہن نشین کرا دی

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
وہاں کنڑ سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا منکا ہے

مگر اب زیادہ مثالیں دینے کا فائدہ؟ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہیں، اور اگر نہیں سمجھے تو آپ میری کتاب 'چینی شاعری' (جس کے ساتھ علامہ بھک بھک اور ان کے بڑے بھائی علامہ بک بک کا بصیرت افروز دیباچہ شامل ہے) خرید کر پڑھیں آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ آپ کا دماغ چکرا جائے گا۔ اور آپ محسوس کریں گے کہ ہندوستانی شاعری چینی شاعری کے سامنے اس طرح معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستانی مٹی کا پیالہ چینی پیالہ کے سامنے (وہ چینی کا پیالہ جو میں نے آل انڈیا نمائش سے خریدا تھا!)



رشید احمد صدیقی

(25 دسمبر 1894ء۔ جنوری 1977ء)

- نام رشید احمد
- رشید احمد صدیقی 25 دسمبر 1894ء کو قصبہ بیریا ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔
- رشید احمد صدیقی کا انتقال جنوری 1977ء میں ہوا اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔
- رشید احمد صدیقی کے والد کا نام عبدالقدیر تھا۔
- رشید احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی اور انھوں نے 1914 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔
- رشید احمد صدیقی نے بی اے 1919 میں اور ایم اے 1921 میں پاس کیا تھا۔
- رشید احمد صدیقی کی شادی جمیلہ خاتون سے 1923 میں ہوئی تھی۔
- رشید احمد صدیقی کی پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔
- رشید احمد صدیقی علی گڑھ منتھلی کے ایک عرصے تک مدیر رہے تھے۔
- رشید احمد صدیقی تاثراتی نقاد ہیں۔
- رشید احمد صدیقی کی تنقیدوں پر تاثراتی تنقید کے بانی اسپنگارن کی چھاپ خاصی حد تک ملتی ہے۔
- رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند تحریک سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔
- رشید احمد صدیقی اکبرالہ آبادی سے متاثر تھے۔
- رشید احمد صدیقی کے مزاح کا بڑا انحصار بذلہ سنجی پر ہے۔
- رشید احمد صدیقی الفاظ کے استعمال اور اپنے اسلوب سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔
- رشید احمد صدیقی الفاظ کے معمولی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔
- رشید احمد صدیقی کے تحریروں میں مقامی رنگ غالب ہے۔
- رشید احمد صدیقی کو والٹر اسکاٹ سے مماثلت دی جا سکتی ہے کیونکہ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں جس طرح علی گڑھ کا جھلک ملتا ہے اسی طرح اسکاٹ کے یہاں اسکاٹ لینڈ کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔
- رشید احمد صدیقی کی بعض تحریروں میں فکر کی گہرائی اور فلسفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔
- رشید احمد صدیقی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معمولی اور بظاہر غیر اہم محسوس ہونے والے واقعات

اور اشیا کے بیان میں غضب کا مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔

اعزازات

- رشید احمد صدیقی کو پدم شری 1963 میں ملا تھا۔
- رشید احمد صدیقی کو غالب کی شخصیت اور شاعری پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 1971 میں ملا تھا۔

رشید احمد صدیقی کے دیگر کارنامے

* طنزیات و مضحکات (تنقید)
* غالب کی شخصیت اور شاعری
* جدید غزل (مضمون)
* آشفتہ بیانی میری (خود نوشت)
* خنداں: رشید احمد صدیقی کے ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔

خاکوں کے مجموعے

(1) گنج ہائے گراں مایہ 1937 (پہلا خاکوں کا مجموعہ) اس میں سولہ خاکے ہیں۔

خاکے: (1) مولانا محمد علی جوہر (2) ڈاکٹر مختار انصاری (3) سید سلیمان اشرف (4) مولانا ابوبکر (5) اصغر حسین گونڈوی (6) محمد ایوب عباس (7) سر محمد اقبال (8) احسن مارہروی (9) سید محفوظ علی بدایونی (10) سید نصیر الدین علوی (11) سجاد حیدر یلدرم (12) سر شاہ سلیمان (13) شیخ حسن عبداللہ (14) تیری یاد کا عالم (15) بابائے اردو مولوی عبدالحق (16) سر ضیاء الدین

* ہم نفسان رفتہ 1966: اس میں سات خاکے ہیں۔

خاکے: (1) شفیق الرحمٰن قدوائی (2) مولانا سید سلیمان ندوی (3) افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق (4) نواب محمد اسماعیل خان (5) مولانا ابوالکلام آزاد (6) پروفیسر احمد شاہ بخاری (7) کندن

دیگر خاکے: اقبال سہیل، شیخ نیازی، ذاکر صاحب، مرشد، گزرگاہ خیال، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، کچھ حسرت کے بارے میں، قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی، جگر صاحب، جواہر لال نہرو

انشائیے: ارہر کا کھیت، وکیل صاحب، مغالطہ، گھاگ، چارپائی، سہیل کی سرگزشت، دیہاتی ڈاکٹر، پاسبان

رشید احمد صدیقی کے اقوال

- شاعر کی زبان سے عالم بے خودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچ کر ہم کو

وارفتۂ ہستی کردیتا ہے۔

- میرے نزدیک مارواڑی عورتیں تین چیزوں کا مجموعہ ہیں گھونگھٹ، گندگی اور گہنا
- صداقت خیال اور اسلوب اظہار کی معراج ہے۔
- رشید احمد صدیقی کے نزدیک تنقید نہ یزداں کا فن ہے اور نہ اہرمن کا فن ہے انسان کا فن ہے۔
- شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔
- جب رزق اور موت کے دروازے بند ہوجاتے ہیں تو ہندوستان میں اخبار نویسوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔
- بجنوری مرحوم مفکر زیادہ اور آرٹسٹ کم تھے۔

رشید احمد صدیقی کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- رشید صاحب کے خیالات میں رومانیت کی جھلک ہے۔ (کلیم الدین احمد)
- اردو نقاد تذکرہ نویسی کے کچھ ایسے خوگر ہوگئے ہیں کہ وہ تنقید کے فرائض کو بحسن وخوبی انجام نہیں دیتے۔ طنزیات ومضحکات بھی تذکرہ نویسی کی ایک مثال ہے۔ (کلیم الدین احمد)
- رشید صاحب کی ظرافت میں جان طنز سے ہی آئی ہے۔ (آل احمد سرور)
- رشید صاحب کے اسلوب کی بنیاد فکر پر ہے محض جمالیاتی کیف، لفظی شعبدہ گری اور تفریح ومزاح پر نہیں۔ وہ پڑھنے والے تک نئی بصیرت پہنچانا چاہتے ہیں۔ (محمد حسن)
- رشید صاحب کا طرز عام فہم نہیں سمجھا جاتا دوسرے ان کے ہاں مقامی رنگ زیادہ ہے جو لوگ علی گڑھ کی اقامتی زندگی، کچی بارک اور پکی بارک کی چپقلش، جہل مرکب اور یونین سے واقف نہیں۔ وہ طنز کی واقعیت اور گہرائی کو پورے طور پر محسوس نہیں کرتے۔ (آل احمد سرور)
- رشید احمد صدیقی کی طنز کو استعاروں، علامتوں اور مبہم اشاروں نے اتنے نقاب پہنا دیئے ہیں کہ صرف وہی لوگ جنھیں اس معطر تنہائی تک رسائی حاصل ہے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ (وزیر آغا)
- رشید احمد صدیقی نے فقرۂ متضاد اور علی گڑھ کو ترتیب دے کر ایک بڑے اور اچھوتے اور اچھے خاصے ذہنی معیار کا ظریفانہ رنگ اختیار کرلیا ہے۔ (عزیز احمد)
- رشیدیات سے لطف اٹھانے کے لیے خود بھی اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں۔ (عبدالماجد دریابادی)

- رشید احمد صدیقی کی ظرافت کا ماحول مقامی اور مخصوص ہے۔ان کے موضوعات زیادہ تر علی گڑھ کی اقامتی زندگی سے متعلق ہیں۔اس لیے بعض اوقات ان کے اشارے نا قابل فہم ہو جاتے ہیں۔(سید عبداللہ)
- رشید لفظوں کے الٹ پھیر اور رعایت لفظی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ان کی تحریر میں چبھن ہوتی ہے جس سے موضوع (یا نشانۂ طنز) جراحت محسوس کر سکتا ہے۔(سید عبداللہ)
- علی گڑھ میں جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں سرفہرست پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہے۔(محمد حسن)
- رشید احمد صدیقی کو اپنے دور کا سب سے بڑا مزاح نگار احتشام حسین نے کہا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے داخل نصاب انشائیے

چارپائی

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسہ، آفس، جیل خانے، کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں۔دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم، اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی۔سی ایس پر، شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

چارپائی کی پیڑھی دور چل کر دیو جانس کلبی کے خم سے جا ملتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا سے منہ موڑ کر دیو جانس ایک خم میں جا بیٹھا تھا۔ہندوستانی تمام دنیا کو چارپائی کے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ایک نے کثرت سے وحدت کی طرف رجوع کیا۔دوسرے نے وحدت سے کثرت کو سمیٹا۔

ہندوستانی ترقی کرتے کرتے تعلیم یافتہ جانور ہی کیوں نہ ہو جائے، اس سے اس کی چارپائیت نہیں جدا کی جا سکتی۔اس وقت ہندوستان کو دو معرکے پیش ہیں۔ایک سوراج کا دوسرا روشن خیال بیوی کا۔دراصل سوراج اور روشن خیال بیوی دونوں ایک ہی مرض کی دو علامتیں ہیں۔دونوں چارپائیت میں مبتلا ہیں۔سوراج تو وہ ایسا چاہتا ہے جس میں انگریز کو حکومت کرنے اور ہندوستانی کو گالی دینے کی آزادی ہو اور بیوی ایسی چاہتا ہے جو گریجویٹ ہو لیکن گالی نہ دے۔

اس طور پر ہندوستانی شوہر اور تعلیم یافتہ بیوی کے درمیان جو کھینچ تان ملتی ہے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ شوہر چارپائی پر سے حکومت کرنا چاہتا ہے اور بیوی ڈرائنگ روم سے گھنٹی بجاتی ہے۔روشن خیال بیوی

شہرت کی آرزومند ہوتی ہے۔ دوسری طرف شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی تو صرف فردِ خاندان ہونے پر صبر کرے اور خود فخرِ خاندان نہیں بلکہ فخرِ کائنات قرار دیا جائے۔

موتی لال نہرو رپورٹ سے پہلے ہندوستانیوں پر دو مصیبتیں نازل تھیں۔ ایک ملیریا کی دوسری مس میو المعروف بہ مادرِ ہند کی۔ ملیریا کا انسداد کچھ تو کونین سے کیا گیا بقیہ کا کثرتِ اموات سے۔ مس میو کے تدارک میں ہندو مسلمان دونوں چارپائی پر سر بزانو اور چوراہوں پر دست و گریباں ہیں۔ نہرو رپورٹ اور مادرِ ہند دونوں میں ایک نسبت ہے۔ ایک نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو اہمیت نہ دی۔ دوسری نے ہندوؤں کے معاشرتی رسوم و روایات کی توہین کی!

مادرِ ہند کے بارے میں چارپائی نشینوں کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے ان کو ہندوستانیوں سے زیادہ مس میو کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر سارے ہندوستان سے شمار و اعداد اور مواد اکٹھا کرنے کے بجائے موصوفہ نے صرف ہم ہندوستانیوں کی چارپائی کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کی تصنیف اس سے زیادہ دلچسپ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔

چارپائی ہندوستانیوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ فتح ہو یا شکست وہ رخ کرے گا ہمیشہ چارپائی کی طرف۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ جائے گا، گائے گا، گالی دے گا یا مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات پڑھنا شروع کردے گا۔

فنِ جنگ یا فنِ صحات کی رو سے آج کل اس طرح کے وظائف ضروری اور نفع بخش خیال کیے جاتے ہیں جس طرح ہر مالدار شریف یا خوش نصیب نہیں ہوتا اسی طرح ہر چارپائی چارپائی نہیں ہوتی۔ کہنے کو تو پلنگ، پلنگڑی، چپرکھٹ، مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن سیاسی لیڈروں کے سیاسی اور مولویوں کے مذہبی تصور کے مانند چارپائی کا صحیح مفہوم اکثر متعین نہیں ہوتا۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب ''ولایت پاس'' ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی آسامی نہ تھی جوان کو دی جاسکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے راجہ صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچادی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کرآئے ہیں۔ راجہ صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہل چل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے۔ یہ ان کی جگہ پر تعینات کردیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینئر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے

ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چارپائی کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتی ہے! فرض کیجیے آپ بیمار ہیں سفر آخرت کا سامان میسر ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو آپ کو دنیا میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیہ تکیے کے نیچے، جوشاندہ کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی۔ بڑی بیوی طبیب، چھوٹی بیوی خدمت گزار، چارپائی سے ملا ہوا بول و براز کا برتن۔ چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے جھاڑو، آش، روئی کے پھائے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھر، بھنگے گھر یا محلے کے دو ایک بچے جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا! اچھے ہو گئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لب گوار لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ، سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھا دی گئی جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب معہ اچکن، ٹوپی، بیگ بقچی کے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بیوقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی ہی پر ان کا منہ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سو رہیں گے۔ سو جانے کے بعد ان پر سے مچھر مکھی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خونچہ پر سے جھاڑو نما مورچھل سے مکھیاں اڑا رہا ہو۔

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلائے گا۔ جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوئی رہتی ہے اس کو لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

فراق اور وصال، بیماری و تندرستی، تصنیف و تالیف، سرقہ اور شاعری سب سے چارپائی ہی پر نپٹتے ہیں۔ بچے بوڑھے اور مریض اس کو بطور پاخانہ، غسل خانہ کام میں لاتے ہیں۔ کبھی ادوان کشادہ کر دی

گئی۔ کبھی بنا ہوا حصہ کاٹ دیا گیا اور کام بن گیا۔ پختہ فرش پر گھسیٹے تو معلوم ہو کوئی ملٹری ٹینک مہم پر جارہا ہے یا بجلی کا تڑا قا ہو رہا ہے۔ کھٹملوں سے نجات پانے کے لیے جو ترکیبیں کی جاتی ہیں اور جس جس آسن میں چارپائی نظر آتی ہے یا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے ان پر غور کر لیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی بیوی کا تخیل ہندوستانیوں نے چارپائی ہی سے لیا ہے۔

دو چارپائیاں اس طور پر کھڑی کر دیں کہ ان کے پائے آمنے سامنے ہو گئے۔ ان پر ایک کمبل، دری یا چادر ڈال دی کمرہ تیار ہو گیا۔ گھر میں بچوں کو اس طرح کا حجرہ بنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہاں وہ ان تمام باتوں کی مشق کرتے ہیں جو ماں باپ کو کرتے دیکھتے ہیں۔ ایٹن، اور ہیرو انگلستان کے دو مشہور پبلک اسکول ہیں۔ ان کے کھیل کے میدان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ واٹرلو کی جنگ یہیں جیتی گئی تھی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ہندوستان کی ساری مہم ہم ہندوستانی چارپائی کے اسی گھروندے میں سر کر چکے ہوتے ہیں۔

برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی ہو۔ کسی گھریلو تقریب میں آپ دیکھیں گے کہ محلہ نہیں سارے قصبہ کی عورتیں خواہ وہ کسی سائز، عمر، مزاج یا مصرف کی ہوں، رونق افروز ہیں اور یہ بتانے کی ضرور

ت نہیں کہ ہر عورت کی گود میں دو ایک بچے اور زبان پر پانچ سات کلماتِ خیر ہوں گے۔ کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آ جاتی ہیں، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکہ اور تانگہ پر ان کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔ یہ اللہ کی مصلحت اور ایجاد کرنے والے کی پیش بینی ہے کہ ہانکنے والے اور گھوڑے دونوں کی پشت سواریوں کی طرف ہوتی ہے اگر کہیں یہ سواریوں کو دیکھتے ہوتے تو یقیناً غش کھا کر گر پڑتے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔ تکیہ کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتا، نقشِ سلیمانی، فہرست دواخانہ، سمّن، جعلی دستاویز کے کچھ مسودے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو اجالا ہو یا اندھیرا اس صحت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا۔ چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنہیں اکثر پھینک کر

مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقف کرنے میں غصہ کا تاؤ مدھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چار پائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانہ سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانسات چھوٹے بڑے بچے اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتے، بلی اور بے شمار مکھیاں آ پہنچیں۔ سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ صاحبِ خانہ صدر دستر خوان ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھی اڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھوکر فکرِ سخن میں چار پائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے، بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔

کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو کہیں گم ہوئی ہو۔ ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا چار پائی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موڑے، مرغی چور کسی کی تخصیص نہیں۔ رات میں کھٹکا ہوا اس نے چار پائی کے نیچے نظر ڈالی۔ خطرہ بڑھا تو چار پائی کے نیچے پناہ لی۔ زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی سرگرمی ہو جو چار پائی یا اس کے آس پاس نہ انجام پائی ہو۔

چار پائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مانند ڈھیلی ڈھالی شکستہ حال بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ۔ کوچ اور صوفے کے دلدادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چار پائی پر میسر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں۔ مثلاً سچے دوست، شرافت فراغت اور گوشۂ چمن، ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چار پائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

بانوں کی ٹوٹی ہوئی چار پائی ہے جسے مکا کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں۔ بارش نے گرد و پیش کو شگفتہ و شاداب کر دیا ہے۔ دور دور جھیلیں جھمکتی، جھلکتی نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی اپنی بولیوں سے برسات کی عملداری اور مزیداری کا اعلان کرتے ہیں۔

مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے۔ اس کے یہاں نہ آسائش ہے نہ آرائش، نہ

عشق و عاشقی، نہ علم و فضل، نہ دولت و اقتدار لیکن یہ سب چار پائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چور مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چار پائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہو جائے گا۔

برسات ہی کا موسم ہے۔ گاؤں میں آموں کا باغ، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، کوئل کوکتی ہے، ہوا لہکتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہی ہیں۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔ سب کے سب جھپٹتے ہیں جس کو مل گیا وہ ہیرو بن گیا جس کو نہ ملا اس پر سب نے ٹھٹھے لگائے۔ یہی لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابلِ التفات نظر نہیں آتیں کسے معلوم آگے چل کر زمانہ ور زندگی کی کن نیرنگیوں کو اجاگر کریں گے۔ کتنے فاقے کریں گے، کتنے فاتح بنیں گے، کتنے نامور اور نیک نام، کتنے گمنام و نافرجام اور یہ خاکسار ایک کھرّی چار پائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے۔ چار پائی باغبان کی ہے۔ باغ کسی اور کا ہے۔ لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں۔ میرے حصّہ کا صرف آم ہے۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے تھوڑا ہے۔ یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیسا تعجب!

پھر عالمِ تصور میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے لیے ہے۔ جو میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے مجھے خالق کا درجہ حاصل ہے۔ اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گزرتا۔ نہ اس کا خیال کہ زمانہ کسے کہتے ہیں۔ نہ اس کی پروا کہ زندگی کیا ہے۔ دوسروں کو ان کا اسیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علیٰحدہ بھی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے مبتلا ہوں۔

وکیل صاحب

متعدد ناکام حملوں کے بعد ایک روز جون کے مہینے میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہیرو یونیورسٹی سے ''حق بخشوانے'' میں کامیاب ہوا اور ایک نیا سوٹ، پرانی ٹائی اور اس سے پرانی ٹوپی جو ایام دماغ سوزی کی ''تفسیر روغنی'' ہو کر رہ گئی تھی زیب سر کر کے کلکٹر صاحب کے بنگلے سے لے کر نینی تال کی بلندیوں تک ڈپٹی کلکٹر کا گز بن گیا تھا۔ گرمی کا موسم جنون و مراق کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے نینی تال، مسوری، شملہ، کسولی وغیرہ میں جب دو ایک گرمیاں سر سے گزر جاتی ہیں تو بقول شخصے ''مغز کی گرمی'' چھٹ جاتی ہے۔ مکان واپس آتے ہیں۔ والدین جو بی اے پاس ہو جانے کے بعد قانون پڑھانا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا حکما منضج کے بعد مسہل دینا اور لیڈرانِ قوم اسپیچ کے بعد چندہ لینا؟ ان کو قانون کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مدت کی سرگرانی کے بعد ''نے محقق بود نہ دانش مند'' ہو کر

واپس آئے۔ اب جو دیکھیے تو ایک ٹوٹے ہوئے سائبان میں ایک خانہ ساز کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ان کے خیالات کی طرح ڈانواں ڈول ایک میز ہے جس کا ای ک پاؤں کسی حادثے کی نذر ہو گیا تھا، اس کے نیچے تین اینٹیں تلے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر تین چار کتابیں، جن کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے اتنے میں ایک گاؤں سے کوئی دہقان اونچی دھوتی، کندھے پر لاٹھی اور لاٹھی کے سرے پر اس کا ایک جوڑا جوتا، جس پر تیل اور گرد کی تہیں جم چکی تھیں، پشت پر پیتل کا ایک لوٹا اور ایک میلی مختصر پوٹلی باہم دست و گریباں، کچھ بوکھلایا ہوا کچھ چوکنا رک کر آتے ہوئے دیکھا۔ فوراً سب سے موٹی کتاب کو اس بدحواسی کے ساتھ کھینچ کر بیچ میں سے پڑھنا شروع کر دیا کہ دوسری کتابیں میز پر منتشر ہو گئیں۔ اس خلفشار میں میز کا پایہ اینٹ پر سے کھسک گیا لیکن ڈگمگاتی ہوئی میز کو ایک طرف سے اپنے پاؤں پر سنبھال کر فوراً دریائے فکر میں غوطے لگانے لگے، ساتھ ہی ساتھ، کنکھیوں سے دہقانی کو بھی دیکھتے جاتے تھے۔ بدقسمتی سے اس کا رخ دوسری طرف مائل ہو گیا۔ انہوں نے مایوسی سے کتاب کو میز پر پٹک دیا۔ میز پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی، ہل چل سے قلابازی کھا گئی، قہر درویش بر جانِ درویش، سر جھکائے ہوئے کیل کانٹے درست کر رہے تھے کہ ایک دوسرا موکل نظر آیا۔ معاً اپنی حالتِ زار کا اندازہ کیا اور سر اٹھا کر کرسی پر واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ سر میز کے نیچے ہے، اُٹھے تو سر میز سے ٹکرا گیا۔ کسان قریب آیا۔ چوٹ کی وجہ سے ایک ہاتھ مقامِ ماؤف پر، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں۔ کچھ خفت کچھ غصہ لیکن یہ سب حالتیں اُس امید پر قابلِ برداشت تھیں جو نووارد کی ذات سے وابستہ تھی۔ آنکھوں کے اشارے سے مطلب دریافت کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس نگاہ میں یاس و امید کے کیسے مدّ و جزر اٹھ رہے تھے۔ کتنے ایسے ہیں جو اس بدنصیب کی ان مبارک اور خوش آئند امیدوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس نے طالب علمی کے زمانے میں محنت اور کلفت کی گھڑیوں میں، شب کی تاریکی، صبح کی سپیدی اور شام کے دھندلکے میں مستقبل کے لیے قائم کر رکھی تھیں۔ نووارد نے ایک دوسرے وکیل کا پتہ دریافت کیا۔ غریب نے ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ کسان روانہ ہو گیا۔ وکیل صاحب کی مایوس نگاہیں کچھ دور تک جانے والے کے ساتھ گئیں پھر تھک کر کہیں رہ گئیں۔

دن کے نو بجے ہیں وکیل صاحب نے کچھ کھا پی کر بستہ سنبھالا۔ شہر کے چوراہے پر یکّے کے انتظار میں جا کھڑے ہوئے۔ ایک ہاتھ میں بدرنگ، شکستہ چھتری، دوسرے میں بستہ، بغل میں چوغہ کی پوٹلی۔ یکّہ والے ۲ر آنے سواری پر مُصر یہ ڈیڑھ آنے سے زیادہ دینے پر قادر نہیں۔ جتنے یک

ے والے سامنے سے گزرے بھی سے ردّ وقدح ہوئی۔ کسی نے ان کا خیال نہیں کیا۔ کسی نے سخت دست بھی کہہ دیا۔ غلط راستے پر کھڑے تھے۔ ایک گھوڑے سے ٹکراتے بچے۔ کانسٹبل نے ڈانٹا اور یہ بیچارے سمٹ سمٹا کر ایک طرف ہو لیے۔ ایک نہایت حقیر اور شکستہ یکّہ پر دو سواریاں پہلے سے موجود تھیں، اس میں ایک زنانی سواری بھی تھی۔ یکّہ بان پیرِ فرتوت، بقول سودا گھوڑا ایسا جسے آگے سے توبڑا دکھلایا جائے اور پیچھے سے لاٹھی ماری جائے تو چلنے پر آمادہ ہو ورنہ پاؤں کے نیچے پہیے لگانے کی ضرورت ہو۔ بہ ہزار دقت ڈیڑھ آنے پر معاملہ طے ہوا۔ یکّہ بان کے ساتھ تیسری سواری ہو کر بیٹھے۔ بستہ بغل میں، سر پر چھتری، یکّہ روانہ ہوا گھوڑے کی چال ان سواریوں کی حالتِ زار کے مطابق تھی۔ ہر ایک پر وجد طاری تھا اور ہچکولوں کی تال وسم پر سر دھنتا تھا یا وکیل صاحب ضابطۂ فوجداری یا ضابطۂ دیوانی کی معلوم نہیں کس دفعہ میں غلطاں و پیچاں تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر لی۔ بستہ معہ پوٹلی کے زمین پر آرہا۔ اور خود کہنیوں کے بل گھوڑے کی پیٹھ پر آرہے۔

کرایہ کے یکّے اور گاڑیوں کو کچہری کے دروازے تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ احاطہ کے باہر وکیل صاحب اتر گئے اور نظر بچاتے ہوئے کچہری کی عمارت میں آئے۔ بستہ عرائض نویسوں اور محرّر کے بوریے پر رکھا، پوٹلی سے نکال کر گاؤن زیبِ تن کیا۔ ایک مدّت گزری کبھی اس چوغہ کا رنگ سیاہ تھا۔ امتدادِ زمانہ اور وکیل صاحب کے پیش روؤں کی سرپرستی سے اس کی رنگت ان بالوں کی سی ہو گئی تھی جن پر عرصہ سے خضاب نہ لگایا گیا ہو پچھلے دامن کی گوٹ علیحدہ ہو کر نیم بیضاوی کی شکل میں ان کی بے گناہی پر خندۂ دنداں نما تھی۔ اس دامن کی ''شہادت'' کے بارے میں بعض اشخاص شبہ ظاہر کرتے تھے کہ یہ سعادت ایک موکل کی دراز دستی سے حاصل ہوئی تھی۔

وکیلوں کے کمرے میں پہنچے۔ یہاں کس کا کون پُرسانِ حال ہوتا۔ ہمارا ہیرو مایوسی و درماندگی کی تصویر بنا ہوا ایک گوشہ میں بیٹھ کر سب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر آخری سگریٹ پینے لگا۔ خیالات کا ہجوم، کمرے میں ہوا کا گزر نہیں۔ دھوئیں کے حلقے فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ سگریٹ کی راکھ میز کے کنارے سے لگا کر گراتا جاتا تھا۔ دوسرے وکلا ہنس بول رہے تھے، شور پکار سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سامنے ایک بوڑھے بنگالی وکیل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میلا بھدّے قسم کا کوٹ، اسی کپڑے کا پائجامہ، پاؤں میں کریپ سول کا ایک پرانا جوتا۔ کاغذ کے ایک خول پر چلم رکھ کر مسلسل کش لگا رہے تھے اور نظر مسل پر لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف موکل جھکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان وکیل اردگرد بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ کبھی کبھی بنگلہ زبان میں کچھ نہ کچھ سمجھاتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں

ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے میں آیا اور کہنے لگا ''حضور پکار ہورہی ہے'' بوڑھا بنگالی اجلاس پر پہنچا۔ چپراسی نے جھک کر سلام کیا اور اس نے پہنچ کر دو ہی ایک جملے کہے، مقدمے کی سماعت ملتوی کردی گئی، تاریخ بھی بدل دی گئی۔ روپیوں کے بوجھ سے بنگالی وکیل کی مضبوط جیب کسی قدر اور لٹک گئی۔ اسی دوران میں حلوائی کا چھوٹا لڑکا پیپل کے ایک ہی پتے کے ہرے دونے میں دو گلاب جامن لایا۔ پیتل کے منجھے ہوئے لوٹے میں پانی بھرا ہوا تھا، بنگالی وکیل نے کریپ سول کا جوتا علیحدہ کیا۔ دونوں گلاب جامنوں کو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے اٹھا کر ٹھیک حلق کے اندر رکھے بعد دیگرے ٹپکا دیا، پورے لوٹے کا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ انگوٹھے کو منہ سے، منہ کو انگوٹھے سے پونچھا اور مسلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ یہ شخص کتنی دولت کا مالک تھا۔ رائے بہادر سی۔ آئی۔ ای پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی اور بنک آف انگلینڈ میں دس لاکھ کا حصہ دار۔

''..... حاضر ہے۔'' عدالت میں پکار ہوئی۔ چپراسی نے کرخت آواز میں مستغیثہ کو آواز دی۔ ایک غریب نوجوان شریف عورت میلے کچیلے لباس میں عدالت کے دروازے پر متوحش کھڑی تھی۔ اس بدنصیب سے چپراسی کو کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی۔ بڑے سخت لہجے میں پوچھا ''تیرا وکیل کون ہے'' غریب عدالت سے ناواقف، طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم، عدالت کا ایوان، ہر طرف دوڑ دھوپ اور ڈانٹ ڈپٹ، یہ غریب ایک دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی جس نے سادہ دل کسان اور مویشیوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔ اس ہنگامے سے اور زیادہ مبہوت ہوگئی۔ چپراسی نے جواب نہ پاکر دھتکار دیا۔ سامنے سے ایک وکیل کا گزر ہوا۔ سر چھوٹا پیٹ بڑا نیت کھوٹی آواز بھاری۔ عورت نے آنکھوں سے اپنی کسمپرسی کی خاموش داستان سنادی۔ وکیل اس عورت کی طرف سے اسی مقدمے کی پیروی کرچکا تھا۔ عورت کی بے بسی کو نظرانداز کرکے فیس کا طالب ہوا۔ غریب نے ہزاروں منتیں کیں، بیوگی اور بے مائیگی کا سانحۂ غم رو رو کر کہہ سنایا لیکن وکیل نے توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔ غریب نے ایک بار پھر عدالت تک پہنچنا چاہا لیکن چپراسی سختی سے مانع ہوا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہوگیا۔

ایک اور وکیل صاحب کلکتہ ہائی کورٹ میں مدت تک کام کرچکے تھے۔ زمانے کی گردش سے مفلوک الحال ہوگئے تھے۔ زندگی کا آفتاب لبِ بام تھا۔ کہولت اور کمزوری کے باعث نشست و برخاست میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن قانون کے روگ میں اب تک مبتلا ہیں۔ عدالت میں ان کا وجود

سب پر وبال ہے۔ وکلاء یا حکام کی لائبریری میں ان کا گزر ہوتا ہے تو لوگ بے رخی سے پیش آتے ہیں۔ تازہ نظائر کے مطالعہ کے شائق ہیں اور ان کا خلاصہ اپنی اس نوٹ بک میں درج کرتے جاتے ہیں جس کے اطراف کی جلد مدت ہوئی حق رفاقت ادا کر کے واصل بحق ہو چکی ہے اور اِدھر اُدھر کے دس بیس اوراق بھی غائب ہو چکے ہیں۔ ہاتھ میں میلے اور مل گجے کاغذات کا ایک پلندہ رہتا تھا جس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان کے ابتدائی زمانہ کے وہ پراسرار کاغذات تھے جن کی نسبت یقین کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ملکی مسائل اور سیاسی اصول پر اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ لوگ متحیر رہ جاتے۔ قانونی نکات خوب سمجھتے تھے لیکن ان کا حلیہ، ان کی حالت، ان کی کہولت کچھ ایسے اسباب تھے کہ ان کی طرف کوئی رخ نہیں کرتا تھا۔

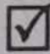
ان کی وضعداری کو دیکھئے دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک نچلے نہ بیٹھتے اور کبھی ایک پیسہ نہ کمایا۔ شام کو گھر کی مراجعت کرتے تو آدھ گھنٹے سے کم وقت کرایہ چکانے میں صرف نہیں کرتے تھے۔ یکہ والے ان کی صورت دیکھ کر پناہ مانگتے تھے۔ یہ الف لیلیٰ کے اس تسمہ پا بوڑھے کی مانند تھے جس کے پاؤں جس کسی کی گردن میں حمائل ہو جاتے تھے، اس کی جان لے کر چھوڑتے تھے۔

وکلاء کے کمرے سے علیحدہ محرروں اور عرائض نویسوں کی نشست گاہ سے متصل ایک صاحب قابلِ توجہ ہیں جو منصفی کے وکیل ہیں۔ سر پر پٹھے جو بیچ سے علیحدہ کر دیے گئے تھے، بال خضاب سے سیاہ، چہرے پر جھرّیاں، آنکھوں میں سُرمے کی تحریر، ململ کی بندارا چکن زیبِ تن، عمامہ برفرق، جیسے ابھی کہیں سے عقد پڑھا کر چھوہارے لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ بڑی مہری کا پاجامہ جس میں چار انگل چوڑی گوٹ لگی ہوئی، حاشیہ کے اندر سرخ ڈورے دے دیے گئے تھے۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا جس میں عرضی دعوے وغیرہ لکھنے کے مجرّب نسخے تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے ان کے شاگرد ہمارے وہ وکیل صاحب بھی رہ چکے تھے جن کا ذکر ابتدا میں آیا ہے۔ ایک شاگرد مسودہ لے کر اصلاح کے لیے حاضر ہوئے، انہوں نے دبیز شیشوں کی عینک ناک کے کنارے پر رکھ کر میلے کچیلے ڈورے سر کے پیچھے کھسکا کر باندھ دیے۔ کاغذ کو ہاتھ میں لے کر انتہائی فاصلے سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی لفظ پر رکے، مسودہ زمین پر پٹک دیا۔ عینک لکڑی کے ایک خول میں جس کا ڈھکنا اسی وقت سے غائب تھا جب سے وکیل صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تھا، بند کر دی گئی۔ غریب شاگرد گھبرایا۔ کچھ دیر تک وکیل صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے۔ آخر کار شاگرد نے ڈرتے ڈرتے عتاب کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میاں تمہیں عرضی دعویٰ لکھنا کیا آئے گا خاک، مدتوں سے ساتھ ہو، اتنا مغز مارتا ہوں لیکن تمہارے دماغ میں کوئی بات نہیں گھستی۔ بس اب ہو چکا، بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔''

شاگرد: ''آخر کیا غلطی ہوئی ہے میں نے حتی الوسع نہایت کوشش سے مسودہ تیار کیا ہے۔'' وکیل صاحب: ''اچھا تو ایک موقع اور دیتا ہوں، غور سے پڑھ جاؤ سامنے ہی غلطی ہے ہاں، شاباش!' شاگرد ایک ایک لفظ غور سے پڑھ گیا، مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی غلطی نہ پاکر کاغذ واپس کر دیا اور عرض کیا: ''وکیل صاحب مجھے تو اب بھی کوئی غلطی نظر نہ آئی۔

وکیل صاحب برافروختہ ہو کر بولے ''کیوں، خلاصہ فریاد ہے، کہاں لکھا ہے۔ بسم اللہ ہی غلط'' شاگرد خاموش ہو گیا اور مایوس وملول گھر واپس آیا۔ ایک بی بی دو بچے موجود تھے۔ بچے دوڑ کر لپٹ گئے جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے ''ابا میرے لیے کیا لائے ہیں۔ میں تو آج ناشپاتی ضرور لوں گی۔ امّاں پیسے نہیں دیتیں کہتی ہیں ابا کچہری سے ناشپاتی لائیں گے'' چھوٹی لڑکی ماں کے پاس سے دوڑ کر بدقسمت باپ کے گھٹنوں میں لپٹ گئی۔ ''ابا کچہری نہ جایا کرو۔ تم نہیں تھے، فاطمہ کی ماں (ہمسائی) آن کر امّاں سے روپے مانگتی تھی اور جب امّاں نے کہا کہ تم کچہری سے آن کر دے دو گے تو وہ بہت بگڑی اور شور مچانے لگی۔ امّاں اب تک رو رہی تھیں، کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچہری سے آتے ہو تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ دن بھر رہا کرو ہم تم ساتھ جھولا جھولیں گے۔ کیوں امّاں، اب بابا بھی ساتھ رہیں گے تو گھر میں آکر کوئی شور نہیں مچائے گا۔''

بیوی جو اُن کے لیے چشم براہ تھی ناہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن متبسم ہو کر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس اندازِ پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''خدا کا شکر ہے میری قسمت ناقابلِ رشک نہیں ہے۔''



اردو کا ٹامس گرے

پطرس بخاری

(یکم اکتوبر 1898ء۔15دسمبر 1958ء)

- نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا اور قلمی نام پطرس
- پطرس یکم اکتوبر 1898ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔
- پطرس کا انتقال 15 دسمبر 1958ء کو نیویارک میں ہوا اور انھیں وہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔
- پطرس کے والد کا نام سید اسد اللہ بخاری تھا۔
- پطرس نے میٹرک کا امتحان 1912 میں انٹر کا امتحان 1915 میں، بی اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور سے 1917 میں اور ایم اے انگریزی میں کیا تھا۔
- پطرس گورنمنٹ کالج کی میگزین 'راوی' کے مدیر 1919 میں مقرر ہوئے تھے۔ اس دوران انھوں نے سول اینڈ ملٹری گزر میں اپنے استاد Peter Waticks کے قلمی نام سے مضامین لکھے تھے۔
- پطرس 26-1925 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔
- پطرس اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے جنرل سکریٹری 1955 میں منتخب کیے گئے تھے۔
- پطرس کے مزاح کی بنیادی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔
- پطرس اپنے طنز و مزاح کا نشانہ اپنی ذات کو بناتے ہیں۔
- مزاح نگاری پطرس بخاری کی تحریروں کی بنیادی خصوصیت ہے۔
- پطرس بخاری کو اردو کا ٹامس گرے کہا جاتا ہے۔
- پطرس بخاری نے سب سے کم مضامین لکھ کر مزاح نگاری میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔

مضامین پطرس

- مضامین پطرس، پطرس بخاری کے 11 مضامین کا مجموعہ ہے۔
- پطرس بخاری نے مضامین پطرس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ

اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔''

- مضامین پطرس کے پہلے ایڈیشن پر دیباچہ رشید احمد صدیقی نے لکھا تھا:

(1) ہاسٹل میں پڑھنا، (2) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی،
(3) کتے (4) اردو کی آخری کتاب
(5) میں ایک میاں ہوں (6) مرید پور کا پیر
(7) انجام بخیر (8) سینما کا عشق
(9) میبل اور میں (10) مرحوم کی یاد میں
(11) لاہور کا جغرافیہ

پطرس کے متعلق رائے

- انھوں نے (پطرس بخاری) نے مغربی ادب سے فیض اٹھاتے ہوئے خالص مزاح کے حربوں یعنی، واقعہ، کردار، موازنہ نگاری کو پروان چڑھانے کی قابل قدر کوشش کی۔'' (وزیر آغا)

پطرس کے داخل نصاب انشائیے

لاہور کا جغرافیہ

تمہید

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرور نہیں کہ کرے کو دائیں سے بائیں گھمایے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں تمام کرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا، تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی دہانت فاتر ہے۔

محل وقوع

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب

پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے، اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یو۔ پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں، اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اس کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا۔ جس کا دار الخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے، جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے۔ جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں، جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے، میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت ہے، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں، بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب وہوا کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور باقی جو ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے اس لیے ممکن ہے تحقیق وتدقیق میں چند سال اور لگ جائیں، عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جابجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کو دل شکنی نہ ہو، شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہ اثر پذیر ہو سکیں جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں۔ اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو گاہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر ان ہی کا

گوشت بکتا ہے۔ اور زمینیں کس کو کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناپستی گھوڑا شکل وصورت میں دم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیوں کہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے، حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس خبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تا کہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات

لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً ''اہل لاہور مژدہ'' یا ''اچھا اور سستا مال'' اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے، جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً ''گریجویٹ درزی ہاؤس'' یا ''اسٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع'' یا ''کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا'' رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کی فلم کے محاسن گنوار کھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہنچانے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں۔ یہ وقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے، ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بحروف جلی ''محمد علی دندان ساز'' لکھا ہے وہ اخبار

انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں ''بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال'' لکھا ہے، وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ ''خالص گھی کی مٹھائی'' امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ ''کرشنا بیوٹی کریم'' شالا مار باغ کو، اور ''کھانسی کا مجرب نسخہ'' جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چوں کہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنان چہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے۔ اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں: قسم اول جمالی کہلاتی ہے، یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں، اور

تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس لیے ہندوستان کا تخت وتاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جود وسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور اداگون اور جمہوریت پر با آواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں، صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصبح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہاسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں، گاتے ضرور ہیں، لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچتے تھے، اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ تعلیم، نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

1۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

2۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔

3۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

(سالنامہ کارواں لاہور 1934ء)

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا:

''مرزا۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟''

مرزا صاحب بولے: ''بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر۔''

میں نے کہا۔ ''میں بتاؤں تمہیں؟''

کہنے لگے۔ ''بولو۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا۔ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو، کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے، تمہاری دم نہیں لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں

کہ بینہ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں، یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا۔ "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پچی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا! میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا پھر بولے۔ "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو، اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے۔ تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔" مرزا بولے۔ "ہوں۔" اب کے مرزا نہیں میں بیپروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور لے جاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے۔ "ہوں۔" میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے، تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا۔ "ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت

تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے، اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔'' مرزا صاحب کہنے لگے۔ ''نہیں یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحب زادے! خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟''

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا۔ ''میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔'' مرزا بولے۔ ''کون کون سی مثلاً؟'' میں نے کہا۔ ''ایک تو میں سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔''

مرزا کہنے لگے۔ ''چلو دس آنے تو یہ ہو گئے، باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے۔ ''میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں ایک بائسیکل لے لو۔''

میں نے کہا۔ ''وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔''

کہنے لگے۔ ''مفت۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''مفت؟ وہ کیسے؟''

کہنے لگے۔ ''مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔''

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔ ''ہے کس کی؟''

مرزا بولے۔ ''میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے تم لے لو۔''

میں نے کہا۔ ''پھر کہنا پھر کہنا!''

کہنے لگے۔ ''بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے، تو تمہاری ہے۔ تم لے لو۔''

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینا پسینا ہو گیا۔ چودھویں صدی میں

ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں؟

میں نے کہا۔ ''مرزا صاحب سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں، جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔''

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

''واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی، میرے پاس ایک بائیسکل ہے، جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''مرزا، مفت میں نہ لوں گا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

مرزا کہنے لگے۔ ''بس میں اسی بات سے ڈرتا تھا، تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، احسان اس میں کوئی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خیر کچھ بھی سہی، تم سچ سچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔''

مرزا بولے۔ ''قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اس کی رہی بھی نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے کتنے میں خریدی تھی؟''

کہنے لگے۔ ''میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی، لیکن اُس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا، اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا بہت پرانی ہے؟''

بولے۔ ''نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا، اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے، آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہے۔ جنھیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی

بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔''

''مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔''

مرزا کہنے لگے۔''تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں، اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن...''

میں نے کہا۔''نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں تم گھر جا کر گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دکان داروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔''

مرزا بولے۔''بھئی جیسے تمہاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔''

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا، وہ بے چارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں؟ آخر بائیسکل ہے؟ ایک سواری ہے۔ فٹنوں، گھوڑوں، موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ باکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے، چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا۔''مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔''

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا۔''کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے، دیر نہ کر دینا... خدا حافظ... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا... خدا حافظ... اور تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تمہارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں... کل صبح آٹھ نو بجے تک... ضرور... خدا حافظ...''

مرزا کہنے لگے۔''ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو

خود ہی ڈلوادوں گا، ورنہ تم خود ہی ڈلوالینا۔"

میں نے کہا۔" ہاں ہاں۔ وہ سب کچھ ہو جائے گا، تم کل بھیج ضرور دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کرلیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح کی ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف وشفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اُٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگالوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور! وہ بائیسکل آگئی ہے۔ میں نے کہا۔" اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا۔" وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی یہ ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لیے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا۔" دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے، اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو... اے بھاگا کہاں جا رہا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے۔ جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو، ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش خروش کے ساتھ ''چل چل چنبیلی باغ میں'' گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے؟ نوکر سے دریافت کیا۔ ''کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟''

نوکر بولا۔ ''حضور یہ بائیسکل ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟''

کہنے لگا۔ ''مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟''

کہنے لگا۔ ''یہی تو ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟''

کہنے لگا۔ ''جی ہاں۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا'' اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

''اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے؟''

''تو یہ میلی کیوں ہے؟''

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

''اور تیل لایا؟''

''ہاں حضور لایا ہوں۔''

''دیا۔''

''حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے۔''

''کیا وجہ؟''

''حضور دھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔''

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ یہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنان چہ نوکر

بولا۔ ”حضور وہ تیل تو سب ادھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو یہ بھی مفید ہوتا ہے۔“

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئی۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں۔ چاں۔ چوں کی قسم آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ، کھڑ کھڑ۔ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھی۔ چر۔ چرخ۔ چر۔ چرخ کی قسم کے سر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کرنے کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اُٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر تھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے سے چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضاء میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جواب تک سو رہے تھے۔ بیدار ہو کر گویا ہوئے۔

ادھر اُدھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چوں کہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ، چچوں پھٹ، کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھیں۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چناں چہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔

چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری تھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہو جانا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کرلوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرالیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا، کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ''دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔'' گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کہ گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہیے چنان چہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے دوکان میں جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''ذرا اس کی مرمت کر دیجیے۔''

ایک مستری آگے بڑھا لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں

کو بڑی بے دردی سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگالیا ہے لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟''

میں نے کہا۔ ''بڑے گستاخ ہو تم دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟''

مستری نے کہا۔ ''مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! وہ بھی ٹھیک کر دو۔''

کہنے لگا۔ ''اگر آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالیں تو اچھا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا کر دو۔''

بولا۔ ''یوں تھوڑا ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔''

''اور پیسے کتنے لو گے؟''

کہنے لگا۔ ''بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔''

ہم نے کہا۔ ''بس جی جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔''

تھوڑی دیر بعد ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بدتمیز کہیں کا، تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟''

بولا۔ ''جناب آپ کو بائیسکل بھی مفت میں ملی ہوگی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟... للّو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔''

میں نے کہا۔ ''واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔''

مستری نے کہا۔ ''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔''

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں نے بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کو چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں، کندھوں، کمر اور بازوؤں میں جابجا درد

ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں میں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپیہ کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ یہ "بائیسکل" ہے۔

دکاندار کہنے لگا۔ "پھر؟"

میں نے کہا۔ "لو گے۔"

کہنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

میں نے کہا۔ "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہو کہ مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے؟ آخر کار بولا۔ "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہو گا؟"

کہنے لگا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔"

کہنے لگا۔ "اچھا چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دکاندار بولا۔ "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔
اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا، آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ''تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟''
میں نے کہا۔ ''تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟''
کہنے لگا۔ ''تو کیا لیں گے آپ؟''
میں نے کہا۔ ''تمھیں بتاؤ۔''
کہنے لگا۔ ''سچ مچ بتاؤں؟''
میں نے کہا۔ ''اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟''

کہنے لگا۔ ''تین روپے دوں گا اس کے۔''
میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا۔
''او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان، مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔
مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں، گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جس میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلہ پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔
جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو، کہاں

جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کاہے کو لے جا رہے ہو؟
سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، انہیں ہنسنے دو، اس قسم کے بے ہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی۔ ''بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے۔ ''بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کے تجھے مزا چکھاؤں گا۔'' ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارا کر کے کہنے لگے۔ ''دیکھا بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں؟''

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا چلتا گیا حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر باکس میں خط ڈالتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

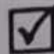
سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازا کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے۔ ''اندر آ جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟''

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔

''مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے میں اب سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔'' گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی۔

(ماہنامہ نیرنگ خیال، لاہور، فروری-مارچ 1932ء)



احمد جمال پاشا کے داخل نصاب انشائیے

کپور

ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

جوادیب طنز نگار ہیں ان میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ان میں سے یہ حضرت کپور بھی ہیں۔ کپور کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک مزاح نگار، ایک طنز نگار ہیں اور اس کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم اور آپ ہوتے ہیں۔تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی برا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کسے پسند ہوتے ہیں۔الٹی چیز سیدھی یا سیدھی چیز الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے کیوں کہ طنز کا تقاضہ ہے کہ وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے۔اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں تین نام لوں گا۔غالب، اقبال اور کپور، غالب اور اقبال کی خطا اس وقت معاف کیجیے اور کپور کی بات کیجیے جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا! خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسنا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔اس لیے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہیے۔طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں۔ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہوسکتا ہے، خون زیادہ خرابہ کم، ایسے ہی مضامین پر میں سردھنا کرتا ہوں، یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔طنزیات و مضحکات میں طنز کا یہ 'تصرف دوام' مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کرسکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ کپور دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو، مجھے گوارہ ہے۔'' (بہ طرز پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اُس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی و معاشرتی حالات اور میکانکی قوت نقد کے ارتقاء کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی کش مکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعدالطبعیات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے مگر اجتماع ضدین مارکسی نقطۂ نظر سے قطعی غیر منطقی ہے کیونکہ اس کے مثبت و منفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لیے مروجہ عصری روایات کی مادیت، ہیئت اور مواد کی گتھیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریت کی عینیت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں زمان و مکان کو اپنی گرفت میں لاکر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادیت کے سماجی محرکات کی سطحی خارجیت کی داخلی کثافتوں سے آلود ہو کر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش کرتی ہے۔ کپور کی واقعیت کا جامد تصور ان کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہ کر دیتا ہے۔ طنز و ظرافت کی یہی مادّی کشمکش سماجی نظام کی حکیمانہ پیروڈی پیش کرتی ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیوں کے مافوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کش مکش دلتاری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم اور محکوم کی یہ کش مکش ان کے طنز کا نشانہ ہے۔" (بطرزِ پروفیسر احتشام حسین)

"اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطۂ خیال۔ یا زیبرے کی موہوم کمر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دل چسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پر فوقیت رکھتا ہے، دنیائے طنز میں اس کی وہی اہمیت ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے، یہ گویا مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے اس سے آگے فکر کی رسائی نہیں، اس محدود طاقت پر پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالباً یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے، مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں، ان کی کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصور نہیں۔ کیوں کہ ان کے خیالات ماخذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخیل ادنی، علمیت غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشا غلط، برخود غلط، پھر کورانہ تقلید میں مثل آفتاب روشن، اس کا

خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روح طنز سے کوئی لگاؤ بھی ہے۔ نظر حسب معمول جسم پر ہے، دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی عینک مانگے کی ہے۔ آواز اپنی نہیں محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے قاری کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک 'نرم گرم' سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا، یہ خیال کہ 'نرم گرم' اردو میں طنز وظرافت کا بہترین کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا ظرافت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز وظرافت کے بیچ میں معلق ہیں، ان کی اہمیت باوجود قابل قدر اضافوں کے بہت زیادہ نہیں، ان کی وقعت مشاعروں کے سبحان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کج روی کے سوا کچھ نہیں، ان کی حیثیت ایک ایسے طالب علم کی ایسی ہے جن کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ ایک طالب علم کے کارنامے جو قابل رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیوں کہ یہ عمر طبعی پر پہنچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے۔ یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنا دیتی ہے اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقاد قلم اٹھاتے ہیں۔'' (بہ طرز پروفیسر کلیم الدین احمد)

''مجھے — یہ — کہنا ہے — کہ — کپور — کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں ان سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے — طنز — میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سعید محمد جعفری، شفیق الرحمن، غلام احمد، فرقت اور کنہیا لال کپور کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شما ر مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پوپ، سوئیفٹ، لیوکاک، مارک ٹوئن وغیرہ کے یہاں جا بجا آپ کو ملے گا۔ اور قدم قدم پر ملے گا، یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز

کا احاطہ کرتے ہیں۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے۔۔ طنز ملتا ہے طنز۔ لہٰذا اس سے یہ بات بخوبی واضح، ثابت اور روشن اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی بہ آسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس طنز کو جو ان کے یہاں ہے، ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو بھی طنز ہوتا۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے۔ ابھی میں نے دلائل وشواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آتی ہوے اور بجنسہٖ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں، اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی میں اب حلف اٹھانے تک کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔'' (بہ طرز ڈاکٹر عبادت بریلوی)

اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا، اقتباس بالا ص 92 سطر 20 خط جو میں نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ نمبر 7 مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ بوسیدہ اور سقیم حالت میں کپور کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال کو اس کی خوش خبری پہنچا دوں کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے۔'' جزئی باتوں سے قطع نظر 12 کتابوں کے 74 دفتروں میں ایک نسخہ اور بھی ناقص مقدمہ ص 101 نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ 'دھوبی کی کھیپ' صفحہ 7 سطر 5 باوجودیکہ مضامین طنزیہ ہیں ور ظرافت کے باب اضافہ کر سکتے ہیں مگر افسوس یہ کہ ان میں جابجا مصدر کی علامتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔ صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک بار ان کا استعمال ملتا ہے۔ اس سے مراد غالباً کاتب ہے جس کو شارحین نے کتابت کا غلط مطلب اخذ کر کے نہ جانے کیا قرار دے دیا ہے (ج چ ص 11) صحت سے بعید ہے، یہ نسخہ بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ (چ غ 3/5) جہاں تک میرا علم ہے مضامین نصاب میں داخل کرنے کی لیے لکھے گئے ہیں۔ 'ہنگامۂ تحریر' نسخہ' تبریزی مطبوعہ

الناظر جلد ہشتم 11 حوالہ بلا سند کے ہے اس وجہ سے اسے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کیوں کہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو 12x22 فٹ کے 662 رم صفحات پر مشتمل ہے 170 سطر فی صفحہ اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر نایاب ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا اقتباس قابل توجہ ہے۔ 'میرا خط میرے نام' رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا تھا۔ اب تک کئی سال ناموں میں معمولی سی رد و بدل و ترمیم کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ حافظے کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ 'نرالی دنیا'، 'الٹی دنیا'، 'سیدھی دنیا' اور 'ہنگامی دنیا' اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ ہنگامہ ہو گیا تھا گو کہ میرے اعتراضات سنگین اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو'' گھریلو جھگڑے ص 123۔ موٹر گائیڈ 12۔ کرامات اُلّو عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی 22 اصولی بحث میں یہاں صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا۔ مثلاً کتاب کے صفحہ 34 سطر 31 میں 'لا' کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے لیے مصنف کی تنبیہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے، کیوں کہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔ پھر سند تو قطعی غلط ہے، حروف تہجی کی ترتیب سرے سے غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے یے سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے۔ 1/2/3/4/5/6/7/8/9 اس بات کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیے۔ اس کے مایوس کن رویہ سے برانگیختہ ہو کر فحش دشنام سے کام لینا یہ بھی ایک کام ہوگا۔ اس قسم کے کاموں کی سخت ضرورت ہے۔ جن تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک بھروسہ کیا، ان کے ساتھ تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جا بجا مترشح ہوتا ہے کہ سہو کا زنا روا رکھا گیا ہے۔ الف... ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ، ر ز ژ، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ء، لا، ھ، ی، یے، 7، 8، 9، 10، 11، 12 مثلاً ج کی جگہ ح کا استعمال کم از کم 17 جگہ صریحاً کیا گیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔ یہ کھلا ہوا ط[illegible] ہے۔ رسالہ 'حمزہ 22، 23، 24، 25 فتح میں، و، اور 'ط' نیک الفحت، فی انی تحت، الفتحہ کا مصدر مفارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔

مزاح میں مرثیہ کی کیفیت کی ذمہ داری اسی لاابالی پن پر ہے۔ 25، 25 لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیر الاستعمال محتاج ثبوت وسند کے اعتبار سے خبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات نثر جا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً نامعتبر ہیں۔ عبارت ذیل کے نکتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے جاسکتے، کیوں کہ ءءءءءءءءءءءءءءءء پس جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارہویں صدی سے ہے اور مصنف مرد نہیں کوئی خاتون ہیں جن کی اردودانی میں

ہمیں شبہ ہے ۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶۶عروس ضمتیں بہ صفحہ اول وصفحہ ثانی میں جا بجا اشتباہ ہے۔ پھر یہ کہ کرۂ ہمزہ بحذف الف لغواور سراسر مہمل و نامستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کپور کے نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے 'سہو طبعی بود' کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، 2، 22، 32، 42، 52، 62، 65، 58، 59، 57، 56، 55، 54، 53، 52، 50..........................ان طنزیات میں 'ش' کے ساتھ محترمہ 'خ' بھی آئی ہیں اور 'ب' کے ساتھ 'پ' بھی۔ مگر افسوس کہ ت کے ساتھ ٹ نہیں ہے۔ ورنہ ان طنزیات کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو جاتی۔ ہائے ہوز کی سخت مٹی پلید کی گئی ہے۔ مصنف خود اس میں اپنے طنز کا نشانہ بن گیا ہے۔ حائے حطی کی ٹھونسم ٹھانس سے طبیعت میں ایک قسم کا بھاری پن اور گراوٹ محسوس ہوتی ہے، طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔ دو چشمی ہے اور ہمزہ کے ساتھ بے تو جبھی کھٹکتی ہے۔ 'واؤ' کا کثرت استعمال کلاسی شان کے خلاف ہے۔ اس کو روایت سے بغاوت متصور کیا جائے گا۔

مخترعات مصنوعی جو منافقوں نے بعد میں بطور حاشیہ پیش کیے ہیں، جمع حاضر، واحد متکلم غائب کے صیغے میں چغد کا استعمال نہایت بے باکی سے کیا گیا ہے مگر اس سے محترمہ کا احمق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر یہ سند ہے کہ بیسویں صدی میں چند سنجیدہ مضمون میں بلا تکلف استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ غریب نہیں تھا بلکہ سماج میں اس کی اہمیت تھی مگر اس سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے لیے کوئی مستند لطیفہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ ضمائر میں مذکر و مونث کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مغرب کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ ضمیر ع۔ فاعل ع۔ مکل ع۔ صفت ع۔ ع۔ ع۔ ع۔ مصدر ع۔ ع۔ حرف ع۔ مفعول ع۔ ع۔ ع۔ ع۔ اس کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ زیر نظر مخطوطے میں کپور نام کا فرد مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور طنزیہ نگاروں میں ید طولیٰ رکھتی تھی جس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ عورت بھی تھی یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بہ طرزِ قاضی عبدالودود)

شامتِ اعمال

ہمارے بھی جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت اور دماغ میں ترنگ رہی ہم نے بھی دنیا بھر کی کمیٹیوں کی ممبری اس شان سے کی جیسے پولیس والے تھانے داری کرتے ہیں۔ اس کمیٹی اور اُس کمیٹی سے اِس کمیٹی گھر بیٹھے الاونس سفر خرچ، آنریریم اور دوسری بے شماروں، ...... کی رقمیں ملا کرتیں۔ میونسپلٹی کی ممبری تو ہمارے یہاں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ ہمارے لیے کوئی اضافہ نہ تھا مگر اس ممبری کے فیض سے ہم الاٹمنٹ کمیٹی، گھڑ دوڑ، کمیٹی اور مالیاتی کمیٹی میں بھی ہر بار لے لیے جاتے۔ ان کمیٹیوں کی

وجہ سے بہت سی مسجدوں، یتیم خانوں اور مشاعروں کی کمیٹیوں نے ہمیں ان کمیٹیوں ک
ے جمع خرچ کا مختارِکل بنادیا اس کے باوجود کیا مجال، جو ہماری سفید پوشی پر حرف آیا ہو۔ مگر
صاحب برا ہو اس گردشِ روزگار کا اور چرخِ کج رفتار کا کہ عین اس وقت جب ہم ساتھ نفرت کے پبلک
لائف سے ریٹائر ہونے کے لیے پَر تول رہے تھے اور شیخ صدیقی سے سید الاصل میں تبدیل ہونے کے
ساتھ ساتھ کئی عدد حج بیت اللہ کر کے الحاج بھی ہو چکے تھے اور ہمارا غریب خانہ بھی کئی عدد فلک بوس
دولت خانوں میں تبدیل ہو چکا تھا اور اسی میں بیٹھ کر اب اللہ اللہ کرنے کا ارادہ تھا کہ شامت جو ہماری
آئی اور سر میں جو ہمارے سمائی تو دوڑ دھوپ اور جوڑ توڑ کر کے ہم کتابوں کی انعامی کمیٹی کے ممبر بن گئے۔

دراصل یہ حادثہ ہماری حیات جاوید کا ایک المناک پہلو ہے تو ہوا یہ کہ انجمن مصنفین کو ان کی
کتابوں پر انعام دیتی تھی۔ اس پر نہ جانے کیسے ہمارے علم و ادب کا سکہ جم گیا اور انجمن 'تقسیم و تحسین
باہمی' نے ہمیں اپنی ممبری کا فارم بھیج دیا جس کی خانہ پری کرتے وقت ہم کو اپنے نکاح نامہ سے لے کر
اپلے نامہ تک یاد آ گئے۔

اس فارم میں ممبری کی شرطیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ مثلاً ممبروں کو ایک ایسا صدر تلاش کرنا
ہوگا جو اس زبان سے نابلد اور منکر ہو جس میں آپ کو انعام دینا ہے۔ اس کے علاوہ کاہلی، درباداری،
حکام رسی، جوڑ توڑ، تعصب، مصلحت کوشی، احباب نوازی اور کینہ پروری کے پچھلے تجربات کی تصدیق اور
تائید ضروری تھی۔ اس کے ساتھ ایک حلف نامہ بھی منسلک تھا جس کو ہم نے فوراً بھروا کر اور اس کی
تصدیق کرا کے انجمن کو بھیج دیا۔ انجمن نے بخوشی نہ صرف ہمیں اپنا ممبر تسلیم کر لیا بلکہ ایک گدھے کی لادی
کتابیں بھی بھیج دیں جن میں سے ہم کو انعام کے لیے کتابیں منتخب کرنا تھیں۔ جہاں پر یہ کتابیں رکھی
ہوئی تھیں وہاں سے گزرتے ہوئے ہم احتیاطاً آنکھیں بند کر کے لاحول پڑھتے ہوئے گزر جاتے کہ
جب زیادہ پڑھنے سے آدمی شیطان ہو جاتا ہے تو خود جو چیز پڑھی جائے وہ کتنی بڑی شیطان ہوگی۔

پہلا کام تو ہم نے اس سلسلہ میں یہ کیا کہ اپنے ملنے جلنے والوں پر رعب جمانے کے لیے ان میں
بڑی دریا دلی کے ساتھ نہ صرف کتابیں تقسیم کر دیں بلکہ ان پر بغیر پڑھے اس قدر جم کر گفتگو کی گویا ہم
بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ اردو میں تنقید کر رہے ہیں۔

جب 'انجمن تقسیم و تحسین باہمی' کا جلسہ بالکل سر پر ہی آ گیا تو ہم ایک ممبر کے یہاں اس سلسل
ے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے پہنچے دیکھا تو ممبر صاحب بہادر نے انعامی کتابیں ڈرائنگ روم
میں سجا رکھی تھیں اور ان کے سامنے دماغی ورزش فرما رہے تھے یعنی حقہ گڑگڑانے کے ساتھ ساتھ شطرنج
سے شوق فرما رہے تھے۔ کچھ کتابیں اس وجہ سے وہاں نہ تھیں کہ وہ یا تو نئی نسل کے نوجوانوں کی لکھی ہوئی

تھیں یا پھر ان کے کمرے کے فرنیچر، پردوں اور دیواروں کے رنگوں سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ یہ بات فاصل ممبر کی نفاست طبع پر گراں گزرنے کے سبب ان نوجوانوں کی کتابوں کو ضائع کر دیا گیا تھا۔

میں نے موصوف سے پوچھا۔ بھائی کچھ سوچا بھی کہ کس کو انعام دیا جائے اور کس کو نہیں۔"

موصوف بولے ابھی میرے سکریٹری نے رپورٹ نہیں تیار کی ہے۔ ضروری کتابوں کی سفارشیں آچکی ہیں۔ ہمارا اصول ہے کہ جتنی بڑی سفارش ہو اتنا بڑا انعام دینا چاہیے۔ اب تو ایک دن پہلے فون پر مطلع کردوں گا۔ آجکل تو صاحب دفتری مصروفیات اتنی ہیں کہ سر اٹھانے تک کا موقع نہیں ملتا ہے۔ یہ کہہ کر صاحب بہادر نے پھر اپنی چال کے آگے سر جھکا دیا اور شہ و مات شروع ہوگئی!

یہاں سے مطمئن ہو کر دوسرے بزرگ کے پاس پہنچا مگر انھوں نے اس سلسلے میں (کہ وہ بھی اس کمیٹی کے ممبر ہیں) اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا مگر جب میں نے ان کو سرکاری کاغذات کا تراشا دکھایا کہ آپ کا نام تو قبلہ سرفہرس ہے۔" تو انھوں نے ڈائری دیکھ کر کہا "الحمدللہ ممبر تو میں بھی ہوں۔" میں نے کہا "پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔ کس کو انعام دیا جائے اور کس کا انعام روکا جائے۔ کتابیں نکلوایئے ان کی ایک فہرست بنا کر اس پر کچھ غور کر لیا جائے۔"

انھوں نے ملازم سے کہا۔

جاؤ انعامی کتابوں والا بنڈل لے آؤ!"

ملازم ایک سربمہر بنڈل لے آیا، اسے دیکھ کر پیر و مرشد نے تبسم فرمایا اور بولے۔

"یہ تو دس سال پرانا بنڈل ہے اس پر ہم انعام دے چکے ہیں۔ اگر نظر نہ پڑتی تو پھر اسی پر انعامات دینے پڑتے۔"

میں نے عرض کیا۔

"آپ اس پر انعامات دے چکے ہیں؟"

انھوں نے فرمایا:

"میاں اللہ اللہ کرو، مہر ٹوٹی یا نہیں۔ مگر کسی کا دل تو نہیں ٹوٹا۔"

ملازم نے کہا: "مگر نیا بنڈل تو آپ اپنی دیہات کی لائبریری بھجوا چکے ہیں۔"

وہ بولے۔ "خیر خیر! کتابوں کے ہونے نہ ہونے سے بحث نہیں۔ مسئلہ کتابوں پر انعام دینے کا ہے۔ آپ کے سپرد میں یہ کام کرتا ہوں۔ آپ ایک دن پہلے فہرست لیتے آیئے گا۔ اس پر غور کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے گا۔"

میں وہاں سے رخصت ہو کر تیسرے ممبر صاحب کے گھر پہنچا۔ وہ اس وقت ترنگ میں تھے اور

لہک لہک کر کجری گا رہے تھے۔سامنے گلابی اور گزک رکھی ہوئی تھی۔ بولے ''آپ نے سارا نشہ ہرن کر دیا۔ میں تو صرف اپنے وطن اور اپنے شہر والوں کو انعام دلواؤں گا اور جس کو آپ لوگ مناسب سمجھیں۔خیر چھوڑیئے۔ یہ سب آپ بھی کس چکر میں پھنسے ہیں۔ لیجیے ایک کجری سنیے۔ابھی ابھی کہی ہے!''

وہاں سے کجری سن کر اٹھے۔تو خیال ہوا کہ ''انجمن تقسیم و تحسین باہمی'' کے صدر صاحب سے بھی نیاز حاصل کیا چاہیے۔موصوف اس وقت تیل مالش، کروا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے:

''بھئی وہ زبان وغیرہ تو میں مانتا نہیں۔مگر امن و امان برقرار رکھنے کے معاملہ میں اگر انعام کا کوئی مستحق نکلے تو مجھے اعتراض بھی نہیں ہے۔آپ لوگ فیصلہ کر لیں بعد میں میں اپنی رائے بھی دے دوں گا۔ میرا کام صدارت کرنا ہے میں کر دوں گا۔''

میں ان کی تعریف و توصیف کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔

اس کے بعد چاروں ممبروں سے ملاقات کی روشنی میں میں نے ایک جامع فہرست تیار کر لی جس میں مصنف کا نام،

عہدہ

مصنف سے حاصل ہونے والے فوائد

انعام دینے کے پہلو

انعام میں پوشیدہ ذاتی مفاد وغیرہ۔وغیرہ۔

میں یہ فہرست لے کر پہلے سے طے شدہ جگہ وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔دیکھا تو پوری کمیٹی جمی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی فہرست ممبروں کے سامنے پیش کر دی۔صدر صاحب بولے۔

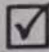
''ٹھیک ہے۔مگر اس میں کسی گمنام یا نوجوان کا نام تو نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔''نہیں! قطعی نہیں۔''

صدر صاحب کے اشارے پر بقیہ ممبروں نے بھی فوراً ایسے غیر اہم نام اپنی فہرست سے خارج کر دیے جو بہت زیادہ بڑے آدمی یا بہت زیادہ مشہور ادیب نہ تھے۔ان ناموں کے نکالے جانے کے بعد فہرست خاصی مختصر ہو گئی اور کام بہت ہلکا ہو گیا اس کے بعد بقیہ نام اس لحاظ سے ترتیب دیے گئے کہ جو جتنا بڑا آدمی یا جتنی بڑی سفارش لایا تھا اتنی ہی اسے اولیت دی گئی۔اس کے بعد بحث شروع ہوئی جس میں یہ الجھن پڑ گئی کہ شاعر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ انعام میرے ضلع والوں کو ملنا چاہیے اور صدر صاحب کا اصرار تھا کہ نہیں پہلے میرے ضلع والوں کو ملنے چاہئیں۔ پروفیسر بدھو اور محمد فاضل میں سے کس کو انعام دیا جائے۔اس پر اتنی بات بڑھ گئی کہ کمیٹی باقاعدہ دو حصوں میں بٹ گئی۔آخر میں صدر

صاحب نے تصفیہ کرایا کہ محمد فاضل صاحب سے ہمارے آپ کے ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ پروفیسر بدھو میں کون سے سرخاب کے پر ہیں۔ غرض کثرت رائے سے محمد فاضل صاحب کو انعام مل گیا۔ اس کے بعد میں نے ایک ہونہار نوجوان کا نام پیش کیا جس کی تصنیف ہر لحاظ سے انعام کی مستحق تھی۔ فوراً چاروں طرف سے انکوائریز آنا شروع ہو گئیں۔ مگر جب سب کو معلوم ہوا کہ صرف کتاب ہی اچھی ہے آدمی یوں ہی ہیں کام وام آنے کے نہیں تو سب نے اس نام کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور نوجوان کا نام پیش کر دیا۔ لوگوں نے اس کو بھی مسترد کرنا چاہا مگر ہم اکڑ گئے کہ آخر ''اقربا پروری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔'' لوگوں نے کہا ''گنجائش نہیں۔'' ہم نے کہا نہیں صاحب گنجائش نکالیے میرے بھتیجے کا معاملہ ہے کسی نے ایک نہ سنی اور مجبوراً غصہ سے بے قابو ہو کر ہم کو جلسے سے واک آؤٹ کرنا پڑا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے واک آؤٹ کی دھونس میں آ کر ممبروں نے ہمارے بھتیجے کو انعام تو دے ہی دیا مگر افسوس کے ہمیں اس کا علم اس وقت ہوا جب ہم کمیٹی کی ممبری سے مستعفی ہو چکے تھے۔

شامت کا لفظ میں نے اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ اس سے قبل بھی ہم نے بے شمار کمیٹیاں چھوڑی اور پکڑی تھیں۔ مگر اس کمیٹی کے چھوڑتے ہی سب ممبروں نے مستحقین کو انعام نہ ملنے کا ذمہ دار ہم کو ٹھہرا دیا۔ اور خود صاف نکل گئے جس کے نتیجے میں ایک تو ہاتھ کچھ نہیں آیا پھر رسوائی اور ذلت ہوئی جس کا بیان یہاں مناسب نہیں مگر ہزاروں دشمن جو پیدا ہو گئے اور جن کی وجہ سے ہمیں اب جو کچھ بھگتنا پڑتا ہے اسے دیکھ دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ ہماری بھی شامت آئی تھی جو انعامی کمیٹی کے ممبر بن بیٹھے۔



مشتاق احمد یوسفی کے داخل نصابی انشائیے

جنونِ لطیفہ

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے! چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام ودہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بدذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے لیکن ہم اعداد وشمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکے۔ ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبدالودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ اب وہ خانساماں جو ستر قسم کے پلاو پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جواب میں انھوں نے بالکل الٹی بات کہی۔

کہنے لگے، ''خانساماں وانساماں غائب نہیں ہو رہے بلکہ غائب ہو رہا ہے وہ ستر قسم کے پلاو کھانے والا طبقہ جو بٹلر اور خانساماں رکھتا تھا اور اڑد کی دال بھی ڈنر جیکٹ پہن کر کھاتا تھا۔ اب اس وضعدار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے نکاح ثانی کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ گیا گزرا باورچی بھی روٹی کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے۔ جبکہ منکوحہ فقط روٹی کپڑے پر ہی راضی ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔''

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ خود کام کرنا بہت آسان ہے مگر دوسروں سے کام لینا نہایت دشوار۔ بالکل اسی طرح جیسے خود مرنے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن دوسروں کو مرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ معمولی سپاہی اور جرنیل میں یہی فرق ہے۔ اب اسے ہماری سخت گیری کہیے یا نااہلی یا کچھ اور، کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بلاقی خاں نے بانٹی۔ ممکن ہے مذکور الصدر حضرات اپنی صفائی میں یہ کہیں کہ:

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں!

لہٰذا ہم تفصیلات سے احتراز کریں گے۔ حالانکہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ من جملہ دیگر مشکلات کے اس سراسیمگی کو بیان کریں جو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم سے ازروئے حساب یہ دریافت کرنے کو کہا جائے کہ اگر نوکر کی 13 دن کی تنخواہ 30 روپے اور کھانا ہے، تو 9 گھنٹے کی تنخواہ بغیر کھانے کے کیا ہوگی؟ ایسے نازک مواقع پر ہم نے سوال کو آسان کرنے کی نیت سے اکثر یہ معقول تجویز پیش کی کہ اس کو پہلے کھانا کھلا دیا جائے۔ لیکن اول تو وہ اس پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔ دوم کھانا تیار ہونے میں ابھی پورا سوا گھنٹہ باقی ہے اور اس سے آپ کو اصولاً اتفاق ہوگا کہ 9 گھنٹے کی اجرت کا حساب ½/10 گھنٹے کے مقابلے میں پھر بھی آسان ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہ انصاف کے طالب— کچھ تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے وہ ہم سے زیادہ خستہ تیغ ستم نکلیں۔ اور کچھ اس ڈر سے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مقصد سر دست ان خانساماؤں کا تعارف کرانا ہے جن کی دامے درمے خدمت کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخی جھلک آئے تو اسے تلخی کام و دہن پر محمول کرتے ہوئے، خانساماؤں کو معاف فرمائیں۔

خانساماں سے عہد وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبدالودود بیگ سے سیکھے۔ یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہر کس و ناکس کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ایک دن ہم نے دیکھا کہ ان کا دیرینہ باورچی بھی ان سے ابے تبے کر کے باتیں کر رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ شرفا میں انداز گفتگو محض مخلص دوستوں کے ساتھ روا ہے۔ جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آنکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے۔ نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ عندیہ بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک شرط انھوں نے یہ بھی لگائی کہ اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے تو پہلے ''عوضی مالک'' پیش کرنا پڑے گا۔

کافی ردو کد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں جو ہم ان میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام کاج میں جتی رہتی ہیں۔ کہنے لگے، ''صاحب! ان کی بات چھوڑیئے۔ وہ گھر کی مالک ہیں۔ میں تو نوکر ہوں!'' ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا۔ میز نہیں لگاؤں گا۔ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاوں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا، ''پھر کیا کرو گے؟''

''یہ تو آپ بتایئے۔ کام آپ کو لینا ہے۔ میں تو تابع دار ہوں۔''

جب سب باتیں حسب منشاء ضرورت (ضرورت ہماری، منشا ان کی) طے ہو گئیں تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیحدہ نوکر نہیں ہے۔ اس لیے کچھ دن تمھیں سودا بھی لانا پڑے گا۔ تنخواہ طے کر لو۔

فرمایا، ''جناب! تنخواہ کی فکر نہ کیجئے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔''

''پھر بھی؟''

کہنے لگے، ''پچھتر روپے ماہوار ہوگی۔ لیکن اگر سودا بھی مجھی کو لانا پڑا تو چالیس روپے ہوگی!''

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا خانساماں آیا مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کا پانی اتارنے کی غرض سے پوچھا، ''مغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟''

''ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔ حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟''

ہم نے صحیح صحیح بتا دیا۔ جھوم ہی تو گئے۔ کہنے لگے، ''میں بھی ایک سال ادھر کاٹ چکا ہوں۔ وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی تو دور دور دھوم ہے۔''

مزید جرح کی ہم میں تاب نہ تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے ہاں ملازم رکھ لیا۔ دوسرے دن پڈنگ بناتے ہوئے انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں، اس لیے بیٹھ کر چولہا نہیں جھونکوں گا۔ مجبوراً کھڑے ہو کر پکانے کا چولہا بنوایا۔

ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا۔ مگر برادے کی انگیٹھی پر۔ چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولھا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولھا خریدا۔ اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا۔ البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں۔ ابتدائے ملازمت سے

ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بلکہ پابندی سے ملاگری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔ آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ، ''گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

تنک کر بولا، ''صاحب! ہاتھ بیچا ہے، زبان نہیں بیچی!''

اس نے نہایت مختصر مگر غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا تو وہ فوراً استعفیٰ دے دے گا۔ اس کے رویے سے ہمیں بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے۔ نیز ہم اس منطقی نتیجے پر پہنچے کہ دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔ اسی طرح ریڈیو والوں کو فرشتے آتشیں گرز مار مار کر بار بار ان ہی کے نشر کیے ہوئے پروگراموں کے ریکارڈ سنائیں گے۔

ہم کھانے کے شوقین ہیں، خوشامد کے بھوکے نہیں (گو کہ اس سے انکار نہیں کہ اپنی تعریف سن کر ہمیں بھی اپنا بنیان تنگ معلوم ہونے لگتا ہے)۔ ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ باورچی کھانا پکانے کے بجائے ہمارے گن گاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم اور سابق آقاوں کا کلمہ پڑھتا رہے۔ جب کہ اس توصیف کا اصل مقصد ہمیں جلانا اور ان خوبیوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہیں۔ اکثر اوقات بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی مرحوم ہوتے تاکہ ہمارا ذکر بھی اتنے ہی پیار سے ہوتا۔ بعض نہایت قابل خانساماوں کو محض اس دور اندیشی کی بنا پر علیحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپیگنڈہ کرتے رہیں۔ جو شخص بھی آتا ہے یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے سابق آقا نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا (یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اصولی طور پر ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن ریزگاری ضرور گن لیتے ہیں)۔ ایک خانساماں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس کا پچھلا ''صاب'' اس قدر شریف آدمی تھا کہ ٹھیک سے گالی تک نہیں دے سکتا تھا۔

ہم نے جل کر کہا، ''پھر تم نے نوکری کیوں چھوڑی؟''

تڑپ کر بولے، ''کون کہتا ہے کہ خدا بخش نے نوکری چھوڑی؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ میری پانچ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی تھی اور اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ تو یہ کہ ان کے گھر کا خرچ بھی میں ردی اخبار اور بیئر کی خالی بوتلیں بیچ کر چلا رہا تھا۔ انھوں نے کبھی حساب نہیں مانگا۔ پھر انھوں نے ایک دن میری صورت دیکھ کر کہا کہ 'خدا بخش! تم بہت تھک گئے ہو۔ دو دن کی چھٹی کر دو اور اپنی صحت بناو۔' دو دن بعد جب میں صحت بنا کر لوٹا تو گھر خالی پایا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ ''تمھارا صاب تو پرسوں ہی

سارا سامان باندھ کر کہیں اور چلا گیا۔" یہ قصہ سنانے کے بعد اس نمک حلال نے ہم سے پیشگی تنخواہ مانگی تاکہ اپنے سابق آقا کے مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔

گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرمانے ایک تجربہ کار خانساماں بھیجا۔ جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا، "بھئی اور تو سب ٹھیک ہے مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

کہنے لگے، "صاب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟"

اس ستم ایجاد کی بدولت برصغیر کے ہر خطے بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں اس ہیچمدان پنبہ دہاں کے دسترخوان پر سمٹ کر آ گئیں۔ مثلاً دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں مسلم کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس قدر ترش ہے کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں تو پٹ سے کھل جائیں۔ پوچھا تو انھوں نے آگاہی بخشی کہ دکن میں رؤسا کھٹا سالن کھاتے ہیں۔ اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اللہ جانے بقیہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔

اسی دن شام کو ہم نے گھبرا کر پوچھا کہ دال میں پرانے جوتوں کی بو کیوں آ رہی ہے؟

جواب میں انھوں نے ایک دھواں دھار تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔

اور دوسرے دن جب ہم نے دریافت کیا کہ بندہ خدا یہ چپاتی ہے یا دسترخوان؟

تو ہنس کر بولے کہ وطن مالوف میں روٹی کے حدود اربعہ یہی ہوتے ہیں۔

آخر کئی فاقوں کے بعد ایک دن ہم نے بہ نظر حوصلہ افزائی کہا:

"آج تم نے چاولوں کا اچار بہت اچھا بنایا ہے۔"

دہکتے ہوئے توے سے بیڑی سلگاتے ہوئے بولے، "بندہ پروری ہے! کاٹھیاواڑی پلاؤ میں قورمے کے مسالے پڑتے ہیں!"

"خوب! مگر یہ قورمے کا مزہ تو نہیں!"

"وہاں قورمے میں اچار کا مسالہ ڈالتے ہیں!"

پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیڑ کر کہا، "میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟"

سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے، "آپ کو معلوم نہیں؟ شاہان اودھ لگی ہوئی فیرنی کھاتے تھے؟"

"مگر تم نے دیکھا کیا انجام ہوا اودھ کی سلطنت کا؟"

مختصر یہ کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ صبح وشام ہمارے ناپختہ ذوق وذائقہ کو سنوارتا اور مشروبات و ماکولات سے وسیع المشربی کا درس دیتا رہا۔ آخر آخر میں مرزا کو شبہ ہو چلا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے جو سالن کے ذریعے صوبائی غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔

اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ واردان بساط خانساماں اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسانی معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے وہ نت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نبات تازہ کو ایک خاص درجہ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر پکایا جائے تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جا سکتے ہیں۔

انہی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچی کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ مہمان بیٹھے ہیں۔ اس وقت سل کھوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان ہی مہمانوں کی تواضع کے لیے سل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا تو محسوس ہوا گویا چٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے کھا رہے تھے اور ہماری طرح کرکرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔ صبح تک سب کو پیچش ہو گئی۔ صرف ہمیں نہیں ہوئی۔ اور ہمیں اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی اس میں مبتلا تھے۔

یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ ہم بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم تو پرانی چال کے آدمی ہیں۔ اس لیے نئی زندگی سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔ موت برحق ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ بلانے کے لیے ہم اپنی نیک کمائی میں سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں کسی مرض ناشناس حکیم کے ہاتھوں مرنے پر بھی چنداں اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط روح قبض کرنے کا اختیار نہیں دینا چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔

بیماری کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی سن لیجیے جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھے)۔ ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اٹھتی ہیں۔ تادم وداع ان کے کھانا پکانے، اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا۔ یعنی ڈرا دھمکا کر اس کی خوبیاں منوا لیتے تھے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کر دیا۔ اس سے قطع نظر، وہ کافی تابعدار تھے۔

تابعدار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ 'چائے لاؤں؟، اور ہم تکلفاً کہتے کہ 'جی چاہے تو لے آو ورنہ نہیں۔' تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں بھی لاتے تھے۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی ان کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ ''اپنا'' اس لیے کہ حالانکہ ہم سب ہی ان کے کھانوں سے عاجز تھے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر پرامن طریق سے رخصت کیا جائے۔ ان کو نوکر رکھنا ایسا ہی ثابت ہوا جیسے کہ شیر ببر پر سوار ہو تو جائے لیکن اترنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔

ایک دن ہم اسی ادھیڑ بن میں لیٹے ہوئے گرم پانی کی بوتل سے پیٹ سینک رہے تھے اور دوا پی پی کر ان کو کوس رہے تھے کہ سر جھکائے آئے اور خلاف معمول ہاتھ جوڑ کر بولے، ''خو! صاب! تم روز روز بیمار اوتا اے۔ اس سے امارا قبیلہ میں بڑا رسوائی، خو، خانہ خراب اوتا اے،'' (صاحب! تم بار بار بیمار ہوتے ہو۔ اس سے ہمارے قبیلے میں ہماری رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہوتا ہے۔) اس کے بعد انھوں نے کہا سنا معاف کرایا، اور بغیر تنخواہ لیے چل دیئے۔

ایسی ہی ایک اور دعوت کا ذکر ہے جس میں چند احباب اور افسران بالا دست مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے جو قورمہ پکایا، اس میں شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کے غوطے لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔ اکا دکا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ:

صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

اور یہ بسا غنیمت تھا کیوں کہ مہمان کے منہ میں پہنچنے کے بعد، غالب کے الفاظ میں، یہ کیفیت تھی کہ:

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے!

دوران ضیافت احباب نے بکمال سنجیدگی مشورہ دیا کہ ''ریفریجریٹر خرید لو۔ روز روز کی جھک جھک سے نجات مل جائے گی۔ بس ایک دن لذیذ کھانا پکوالو۔ اور ہفتے بھر ٹھاٹ سے کھاؤ اور کھلاؤ۔''

قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے، اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

ہم نے اس عذاب مسلسل کی شکایت کی تو وہی احباب تلقین فرمانے لگے کہ

''جب خرچ کیا ہے صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

کل پھر مرزا سے اپنی گوناگوں مشکلات کا ذکر کیا تو کہنے لگے:

''یہ الجھنیں آپ نے اپنے چٹورپن سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں۔ ورنہ سادہ غذا اور اعلیٰ خیالات سے یہ مسئلہ کبھی کا خود بخود حل ہو گیا ہوتا۔ یہی آئین قدرت ہے اور یہی آزاد تہذیب کی اساس

بھی! آپ نے مولوی اسماعیل میرٹھی کا وہ پاکیزہ شعر نہیں پڑھا؟

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر

تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

عرض کیا، ''مجھے کسی کے آزاد رہنے پر، خواہ شاعر ہی کیوں نہ ہو، کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس شعر پر مجھے عرصہ سے یہ اعتراض ہے کہ اس میں آزادی سے زیادہ خشک روٹی کی تعریف کی گئی ہے۔ ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کر سکتی۔''

فرمایا، ''برداشت کی ایک ہی رہی! خراب کھانا کھا کر بدمزہ نہ ہونا، یہی شرافت کی دلیل ہے۔''

گزارش کی، ''مردانگی تو یہ ہے کہ آدمی عرصہ تک عمدہ غذا کھائے اور شرافت کے جامے سے باہر نہ ہو!''

مشتعل ہو گئے، ''بجا! لیکن یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آدمی اٹھتے بیٹھتے کھانے کا ذکر کرتا رہے۔ برا نہ مانیے گا۔ آپ کے بعض مضامین کسی بگڑے ہوئے شاہی رکابدار کی خاندانی بیاض معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو کم پڑھی لکھی عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔''

ہم نے ٹوکا، ''آپ بھول رہے ہیں کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔''

وہ بگڑ گئے، ''مگر آپ نے تو اسے جنونِ لطیفہ کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی اپنی بے قصور قوم کی اصلاح کے درپے ہیں تو کوئی کام کی بات کیجیے اور ترقی کی راہیں بجھائیے۔''

مزہ لینے کی خاطر چھیڑا، ''ایک دفعہ قوم کو اچھا پہننے اور کھانے کا چسکا لگ گیا تو ترقی کی راہیں خود بخود سوجھ جائیں گی۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ جس دیس میں لاکھوں آدمیوں کو دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہوتا ہو، وہاں بھگوان کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ ان داتا کے سوا کسی اور روپ میں سامنے آ سکے۔ بھوکے کے لیے بھوجن ہی بھگوان کا اوتار ہے اور......''

قطع کلامی کی معافی مانگے بغیر بولے، ''مگر وہ تو بکری کا دودھ اور کھجور کھاتے تھے اور آپ فنِ غذا شناسی کو فلسفہ خدا شناسی سمجھ بیٹھے ہیں۔ خود آپ کے محبوب یونانی فلسفی جو بھرپور زندگی کے قائل تھے، دماغ سے محسوس کرتے اور دل سے سوچتے تھے۔ مگر آپ تو معدے سے سوچتے ہیں اور دیکھا جائے تو آپ آج بھی وہی مشورہ دے رہے ہیں جو ملکہ میری انطونیت نے دیا تھا۔ ایک درباری نے جب اس کے گوش گزار کیا کہ روٹی نہ ملنے کے سبب ہزاروں انسان پیرس کی گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں تو اس نے حیرت سے پوچھا کہ یہ احمق کیک کیوں نہیں کھاتے؟''

اور آنا گھر میں مرغیوں کا

عرض کیا۔ ''کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید۔''

''اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتیلی کا اور اضافہ کر لیجیے۔'' انہوں نے بات کاٹی۔

پھر عرض کیا۔ ''اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مرغی عمر طبعی کو نہیں پہنچ پاتی۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔''

فرمایا۔ ''یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا۔ اسے مرغ مسلّم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لیے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو درکنار۔ میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ہوٹلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے دگنے داموں بیچیے۔ یوں تو اس میں، میرا مطلب ہے تازے انڈے میں:

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار پکے گا۔ آملیٹ، نیم برشت، تلا ہوا، خاگینہ، حلوا۔''

اس کے بعد انہوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آملیٹ اور خاگینہ وغیرہ بگاڑنے کے لیے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو فی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا۔ ''یہ سب درست! لیکن اگر مرغیاں کھانے پر اتر آئیں تو ایک ہی ماہ میں ڈربے کے ڈربے صاف ہو جائیں گے۔''

کہنے لگے۔ ''یہ نسل مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو خود حساب کر کے دیکھ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتداء کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل کی مرغی سال میں اوسطاً دو سو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے۔ لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مرغی ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔''

میں نے ٹوکا۔ ''مگر میری قنوطیت کا مرغی کی انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟''

بولے۔ ''بھئی آپ تو قدم قدم پر الجھتے ہیں۔ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ خیر۔ اس کو جانے دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہوں گے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی۔ جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق، تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔''

''مگر یہ سب کھائیں گے کیا۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

ارشاد ہوا۔ ''مرغ اور ملا کے رزق کی فکر تو اللہ میاں کو بھی نہیں ہوتی۔ اس کی خوبی یہی ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھیے۔ دانہ دنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر، پتھر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیں گے۔''

پوچھا۔ ''اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان و نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔''

فرمایا۔ ''یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق ردوقدح کی۔ آپ جانتے ہیں میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آ پڑی ہے کہ کل کچھ سسرالی عزیز چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ اس لیے...''

اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں سسرالی عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آگئیں۔

اب اس کو میری سادہ لوحی کہیے یا خلوص نیت کے شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے پالتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کا حکم بجالائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہاوت کا آنکس پہچانتا ہے۔ کتا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے۔ جس سے مالک کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔ سانپ بھی سپیرے سے ہل جاتا ہے۔ لیکن مرغیاں!

میں نے آج تک کوئی مرغی ایسی نہیں دیکھی جو مرغ کے سوا کسی اور کو پہچانے اور نہ ایسا مرغ نظر سے گزرا جس کو اپنے پرائے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی داشت اور سنبھال کیجیے۔ برسوں ہتھیلیوں پر چگائیے۔ لیکن کیا مجال کہ آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے، یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لوٹیں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے ''سپردم بتو مایۂ خویش را'' کہتی ہوئی مجھے سونپ کر الٹے قدموں واپس چلی جائیں گی۔ تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ہر چمکتی چیز کو چھری سمجھ کر بدکنے لگے۔ اور مہینوں کی پرورش

و پرداخت کے باوجود محض اپنے جبلی تعصب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا تصور کرے۔

انہیں مانوس کرنے کے خیال سے بچوں نے ہر ایک مرغ کا علیحدہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ اکثر کے نام سابق لیڈروں اور خاندان کے بزرگوں پر رکھے گئے۔ گو ان بزرگوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا مگر ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ کا کہنا تھا کہ یہ بیچارے مرغوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ لیکن ان ناموں کے باوصف مجھے ایک ہی نسل کے مرغوں میں آج تک کوئی ایسی خصوصیت نظر نہ آئی جو ایک مرغ کو دوسرے سے تمیز کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سب مرغ، نوزائیدہ بچے اور سکھ ایک جیسی شکل کے نظر آتے ہیں۔ اور انہیں دیکھ کر اپنی بینائی اور حافظے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی شناخت اور تشخیص کے لیے خاص مہارت و ملکہ درکار ہو۔ جس کی خود میں تاب نہ پا کر اپنے حواس خمسہ سے مایوس ہو جاتا ہوں۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اردو شعراء بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مرغ اور ملا صرف صبح اذان دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنے عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مرغ کے اذان دینے کے لیے مقرر کیا ہے یا یہ ادبدا کر اس وقت اذان دیتا ہے جب خدا کے گنہگار بندے خواب غفلت میں پڑے ہوں۔ بہر صورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ آج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مرغ بانگ نہ دے تو پو نہیں پھٹتی، لہذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مرغ پال لیتے ہیں تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر حلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان کی بانگ سن کر ایک دفعہ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کر اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر مرغ اذان کیوں دیتا ہے! ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معتبر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مرغ کی اذان دراصل عبادت ہے۔ لہذا جب مرزا عبدالودود بیگ نے ہم سے پوچھا کہ مرغ اذان کیوں دیتا ہے! تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد و ثناء کرتا ہے۔

کہنے لگے "صاحب اگر یہ جانور واقعی عبادت گزار ہے تو مولوی صاحب اتنے شوق سے کیوں

کھاتے ہیں؟"

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا کہ تین مرغے میرے پلنگ پر باجماعت اذان دے رہے ہیں۔ سفید چادر پر جا بجا پنجوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جگہ خالی رہ گئی تھی، وہاں سفید دھبے نہایت بدنام معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا۔ "آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں۔"

بولیں۔ "آپ تو خواہ مخواہ الرجک (Allergic) ہو گئے ہیں۔ یہ بیچارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں۔"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا۔ بس بہت ہو چکا، آؤ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔ "اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں۔" میں نے بپھر کر کہا۔

ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہراساں ہو کر کہنے لگیں۔ "مینہ برستے میں آپ کہاں جائیں گے۔"

اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں، خواہ سونے کا نوالہ کھلائیں مگر اس کو کیڑے مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چیونٹے اور کیچوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے، اور میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا اثر و نفوذ انڈے میں نہ ہو۔ پھر موپساں کے افسانے کا ہیرو اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مرغی نے کیا کھایا تھا تو اچنبھے کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی رہے ہیں جو ذرا سی بوٹی چکھ کر نہ صرف بکری کے چارے بلکہ چال چلن کا بھی مفصل حال بتا سکتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ کھلی اور بھوسے کی خاصیت، اور چوپایوں کی خصلت کے پیش نظر، بعض نفاست پسند والیان ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دسترخوان پر آئے، ان کو صبح و شام بادام اور پستے کھلائے جائیں تا کہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عمدہ دودھ کی خوبی یہ تھی کہ اسے پی کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہ عام کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں یہ ہے کہ مرغیاں ڈربے اور ٹاپے میں رہتی ہیں، میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مرغیاں ڈربے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں، وہاں اپنے ورود و نزول کا ناقابل تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور

کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مرغی اور ڈربے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرہ کا معمول ہوگیا۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مگر میرے ہیلو! کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہوکر اذان دی، اور جن صاحب نے ازراہ تلطف مجھے یاد فرمایا تھا انہوں نے ''سوری رانگ نمبر'' کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔

پھر ایک اتوار کو شور سے آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ بچے اصیل مرغ کو مار مار کر بیضوی پیپر ویٹ پر بٹھا رہے ہیں۔ مانتا ہوں کہ اس دفعہ مرغ بے قصور تھا۔ لیکن دوسرے دن اتفاقاً دفتر سے ذرا جلد واپس آگیا تو دیکھا کہ محلے بھر کے بچے جمع ہیں اور ان کے سروں پر چیل کوے منڈلا رہے ہیں۔ ذرا نزدیک گیا تو پتا چلا کہ میرے نئے کیرم بورڈ پر لنگڑے مرغ کا جنازہ بڑی دھوم سے نکل رہا تھا۔ سب بچے اپنے اپنے قد کے مطابق چار چار کی ٹولیوں میں بٹ گئے اور باری باری کندھا دے رہے تھے۔

غور سے دیکھا تو جلوس کے آخر میں کچھ ایسے شرکاء بھی نظر آئے جو گھٹنیوں چل رہے تھے اور اس بات پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے کہ انہیں کندھا دینے کا موقع کیوں نہیں دیا جاتا۔

اور اس کے کچھ دن بعد چشم حیراں نے دیکھا کہ ہمسایوں میں شیرینی تقسیم ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ ''شہ رخ'' (چتکبرا مرغ) نے آج پہلی بار اذان دی ہے۔ میں نے اس فضول خرچی پر ڈانٹا تو میرا تردد رفع کرنے کی خاطر مجھے مطلع کیا گیا کہ خالی بوتلیں، میرے پہلے ناول کا مسودہ اور اسناد کا پلندہ (جو بقول ان کی دس برس سے بیکار پڑا تھا) ردی والے کو اچھے داموں بیچ کر یہ تقریب منائی جا رہی ہے۔

قصہ مختصر چند ہی مہینوں میں اس طائر لاہوتی نے گھر کا وہ نقشہ کر دیا کہ اسے دیکھ کر وہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا تھا جو قدرے مختلف حالات میں حُسنا پری نے حاتم طائی کو سنایا تھا

یہ گھر جو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اب گھر اچھا خاصا پولٹری فارم (مرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پولٹری فارم میں عام طور سے اتنے آدمیوں کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جو حضرات آلام دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہیں، ان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مرغیاں پال لیں۔ پھر اس کے بعد پردۂ غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود کھڑے ہوں گے کہ انہیں اپنی گزشتہ زندگی جنت کا نمونہ معلوم ہوگی!

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ادھر ایک تشویش ناک صورت یہ رونما ہوئی کہ ایک مرغ کٹ کھنا ہوگیا۔ پہلے تو ہوا یہ کرتا تھا کہ جب بچوں کو تماشا دیکھنا منظور ہوتا تو دو مرغوں کے منہ پر توے کی کلونس لگا

کر کھانے کی میز پر چھوڑ دیتے اور لڑائی کے بعد میز پوش کے داغ دھبوں کو ربڑ سے مٹانے کی کوشش کرتے۔ لیکن اب کسی اہتمام کی ضرورت نہ رہی، کیوں کہ وہ دن بھر پڑوسیوں کے مرغوں سے فی سبیل اللہ لڑتا اور شام کو مجھے لڑاتا۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ مرغ کے مشاغل وفرائض منصبی کے بارے میں میرا اب بھی یہ تصور ہے کہ

مرغا وہ مرغیوں میں جو کھیلے
نہ کہ مرغوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

معاملہ ہم جنس تک ہی رہتا تو غنیمت تھا لیکن اب تو یہ ظالم مرغیوں سے زیادہ آنے جانے والوں پر نظر رکھنے لگا۔ مرزا عبدالودود بیگ سے میں نے ایک دفعہ تذکرہ کیا تو کہنے لگے کیا بات ہے۔ ہم پر تو ذرا نہیں لپکتا۔ ان کے جانے کے بعد راقم الحروف قد آدم آئینے کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ لیکن عکس میں بظاہر کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جسے دیکھتے ہی کسی امن پسند جانور کی آنکھوں میں خون اتر آئے۔ بہر حال جب پڑوسیوں کی شکایتیں بڑھیں تو ایک مشہور مرغ باز سے رجوع کیا۔ اس نے کہا کہ قدرت نے اس پرند کو ہر لحاظ سے ہری چگ بنایا ہے اور یہ مرغ غالباً اس لیے کٹ کھنا ہو گیا کہ آپ نے اسے بچا کچھا گوشت کھلا دیا۔ میں نے گھر پہنچ کر تشخیص سے آگاہ کیا تو کہنے لگیں۔

''توبہ! اب ہم اتنے برے بھی نہیں کہ ہمارا جھوٹا کھانا کھا کے اس منحوس کا یہ حال ہو جائے۔''

افتادِ طبع کے اعتبار سے میں گوشہ نشین واقع ہوا ہوں۔ اور اگر یہ مرغیاں نہ ہوتیں تو محلے میں مجھے کوئی نہ جانتا۔ ان دنوں ''ڈربے والا مکان'' اس علاقے میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا تھا جس کے حوالے سے ہمسائے اپنی گمنام کوٹھیوں کا پتہ بتاتے تھے۔ انھی کے توسل سے ہمسایوں سے تعارف اور تعلق ہوا۔ اور انھی کی بدولت بہت سی دوررس اور دیرپا رنجشوں کی بنیاد پڑی۔ شمعون صاحب سے اس لیے عداوت ہوئی کہ میری مرغی ان کی گلاب کی پود کھا گئی اور ہارون صاحب سے اس واسطے بگاڑ ہوا کہ ان کا کتا اس مرغی کو کھا گیا۔ دونوں مجھی سے خفا تھے۔ حالانکہ منطق اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ دونوں حضرات اس قضیے کو آپس میں بالا ہی بالا طے کر لیتے۔

اور جس دن خلیل منزل والے ایک قوی ہیکل ''لائٹ سسیکس'' مرغ کہیں سے لے آئے تو ہمارے ڈربوں میں گویا ہلچل سی مچ گئی۔ جب وہ گردن پھلا کر اذان دیتا تو مرغیاں تڑپ کر ہی رہ جاتیں۔ خود خلیل صاحب اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ حالانکہ میری ناقص رائے میں کسی مرغ کو دیکھ کر اس قدر خوش ہونے کا حق صرف مرغیوں کو پہنچتا ہے۔ میں تو اسی وجہ سے اپنے سے بہتر نسل کا جانور پالنے کے سخت خلاف ہوں۔ بہر حال یہ اپنے اپنے ظرف اور ذوق کا سوال ہے، جس سے مجھے فی الحال

کوئی سروکار نہیں۔ کہہ یہ رہا تھا جس روز سے اس کا ہمارے یہاں آنا جانا ہوا مجھے اپنے تعلقات خراب ہوتے نظر آئے۔ آخر ایک دن اس نے ہماری بکاؤلی (سیاہ منار کا مرغی) کی آنکھ پھوڑ دی۔ رات بھر اپنی تقریر کا ریہرسل کرنے کے بعد میں دوسرے دن خلیل صاحب کو ڈانٹنے گیا۔ جس وقت میں پہنچا تو وہ اپنی ہتھیلی پر ایک انڈا رکھے حاضرین کو اس طرح اترا اترا کر دکھا رہے تھے جیسے وہ ان کی ذاتی محنت اور صبر کا پھل ہو۔

ملاقات کی روداد درج ذیل ہے:

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں ڈربے والے مکان میں رہتا ہوں۔''

بولے۔ ''کوئی حرج نہیں۔''

مین نے کہا۔ ''کل آپ کے مرغے نے میری مرغی کی آنکھ پھوڑ دی۔''

فرمایا۔ ''اطلاع کا شکریہ۔ دائیں یا بائیں!''

حافظے پر بہت زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا کہ کون سی تھی۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

کہنے لگے۔ ''آپ کے نزدیک دائیں بائیں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

''مگر یہ غلط بات ہے۔'' میں نے اصل واقعہ کی طرف توجہ دلائی۔

''جی ہاں۔ صریحاً غلط بات ہے۔ اس لیے کہ آپ کی مرغی دوغلی ہے اور...''

''اور آپ کا مرغا راج ہنس ہے۔'' میں نے بات کاٹی۔

تڑپ کر بولے۔ ''آپ مجھے برا بھلا کہہ لیجیے۔ مرغ تک کیوں جاتے ہیں! (ذرا دم لے کر) لیکن قبلہ اگر وہ راج ہنس نہیں ہے تو آپ کی مرغی یہاں کیوں آئی۔''

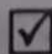
''آخر جانور ہی تو ہے۔ انسان تو نہیں جو منہ باندھے پڑا رہے۔'' میں نے سمجھایا۔

ارشاد ہوا۔ ''آپ اپنی پدمنی کو باندھ کے نہیں رکھ سکتے تو بندہ بھی اس کی چونچ پر غلاف چڑھانے سے رہا۔''

غرض کہ ظلم و زیادتی کے خلاف جب بھی آواز اٹھائی، اسی طرح اپنی رہی سہی اوقات خراب کرائی۔

اگرچہ بارہا رانی کھیت کی وبا آئی اور آن کی آن میں ڈربے کے ڈربے صاف کر گئی، لیکن اللہ کی رحمت سے ہماری مرغیاں ہر دفعہ محفوظ رہیں۔ مگر آئے دن کی رقابتیں اور رنجشیں رانی کھیت سے زیادہ جان لیوا ثابت ہوئیں اور قضیہ رفتہ رفتہ یوں طے ہوا کہ کچھ مرغیاں تو پڑوسیوں کے کتے کھا گئے اور جوان سے بچ رہیں، ان کو پڑوسی خود کھا گئے۔

اللہ بس باقی ہوس!



اردو میں خاکہ نگاری کا فن

- خاکہ کے معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔
- خاکہ کے لیے اردو میں مرقع، شخصی مرقع، چہرہ بشرہ، قلمی تصویر، جیتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔
- ادبی اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہوتی ہے جس میں نہایت اختصار کے ساتھ اشارے کنایے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں مبالغے کے بغیر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔
- خاکہ کسی شخص سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت، دوستی، دلچسپی اور یادوں کی ایک لفظی تصویر ہوتی ہے جو کسی جگہ نہایت بے ساختہ انداز میں شروع ہوتی اور غیر روایتی انداز میں کہیں ختم ہوجاتی ہے۔
- بقول انور ظہیر خان خاکہ میں دال میں نمک کے برابر تخیل کی کارفرمائی تو ہوسکتی ہے لیکن ابہام، مبالغہ اور غلو کی آمیزش ناقابل قبول ہوتی ہے۔
- بقول نثار احمد فاروقی خاکہ نگاری سوانح عمری سے مختلف چیز ہے کہ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن خاکے میں سوانح عمری مشکل سے سماتی ہے۔
- خاکہ نگاری کے فن کو بعض نقادوں نے اشارے کا فن قرار دیا ہے اور اسے غزل کے فن سے مماثلت دی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات سمودی جائے۔
- بقول نثار احمد فاروقی خاکہ شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ اچھا خاکہ دراصل کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔

خاکہ نگاری کے لیے شرطیں اور ہدایتیں

1: خاکہ نگار کوشش کرکے ممدوح کی شخصیت کھولنے میں اس کے ذہنی میلان اور نفسیات تک رسائی کرے۔
2: جس کا خاکہ لکھا جارہا ہے اس کے چہرے بشرے اور اس کی نشست و برخواست کی پیش کش میں خاکہ نگار زیادہ نمک مرچ نہ لگائے۔
3: حد درجہ جزئیات نگاری اور علمی فتوحات کے ذکر سے پرہیز کرے۔
4: کسی بڑی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لیے اس کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات اور

سرگرمیوں سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔

5: شخصیت یا اس کے کسی کارنامے پر خاکہ نگار اپنی تنقیدی رائے دینے سے پرہیز کرے۔

6: ذاتی پسند و ناپسند سے زیادہ خاکہ نگار ممدوح کے سچی حالات زندگی اور حرکات وسکنات پر نظر ڈالے۔

7: خاکہ محض زبان کے چٹخارے کے لیے نہیں لکھا جائے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی سبق آموز پہلو بھی ہو۔

8: خامہ نگار اپنے ممدوح سے ہمدردی ضروری رکھے لیکن جانب داری سے بھی پرہیز کرے۔

9: ممدوح کی شخصیت کو خاکہ نگار خود پر کبھی بھی حاوی نہ ہونے دے اور نہ خود اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرے۔

10: خاکہ میں زبردستی مزاح پیدا کرنے سے اس کا پورا نظام نثر مجروح ہوسکتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز وارتقا

- مرزا فرحت اللہ بیگ کو باقاعدہ پہلا خاکہ نگار کہا جاتا ہے۔ اور ان کی تصنیف ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کو پہلا خاکہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی اور سجاد حیدر یلدرم ان سے پہلے خاکہ لکھ چکے ہیں۔

اردو میں خاکہ نگاری فرحت اللہ بیگ کے عہد میں:

- عبدالحلیم شرر:
- خواجہ حسن نظامی: قلمی چہرے (مجموعہ)
- سجاد حیدر یلدرم: خافی خان (حسرت موہانی کا خاکہ)
- مرزا فرحت اللہ بیگ: نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، وصیت کی تعمیل، یاد ایام عشرت
- عبدالرزاق کانپوری: یاد ایام (راس مسعود کی فرمائش پر سرسید اوان کے رفقا کا خاکہ)

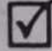
خاکہ نگاری کا ارتقا

- مولوی عبدالحق : چند ہم عصر (مجموعہ، کندن اسی مجموعے میں شامل ہے)
- رشید احمد صدیقی : گنج ہائے گراں مایہ (پہلا مجموعہ) ہم نفسان رفتہ (مجموعہ)
- اشرف صبوحی : دلی کی چند عجیب ہستیاں (مجموعہ)، غبار کارواں (مجموعہ)

- چراغ حسن حسرت: مردم دیدہ
- شاہد احمد دہلوی : گنجینۂ گوہر 1962
- خاکوں کا مجموعہ اور نئے ادب کے معمار: (اس میں سعادت حسن منٹو پر کرشن چندر کا لکھا ہوا، مخدوم محی الدین پر سردار جعفری کا لکھا ہوا، مجاز پر عصمت چغتائی کا لکھا ہوا اور دیوندر ستیارتھی پر ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا خاکہ شامل ہے۔)
- فکر تونسوی : خدوخال (مجموعہ)
- عصمت : دوزخی (بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ)
- منٹو : گنجے فرشتے (مجموعہ)، لاؤڈ اسپیکر (مجموعہ)، شخصیتیں (مجموعہ)
- محمد طفیل :
- ضیاالدین برنی : عظمت رفتہ (۹۳ شخصیات کے خاکے)
- عبدالمجید سالک : یاران کہن (مجموعہ)
- اخلاق احمد دہلوی: اور پھر بیاں اپنا، پھر وہی بیاں اپنا
- رئیس احمد جعفری : دید و شنید
- شورش کاشمیری : نورتن، چہرے
- شوکت تھانوی : شیش محل (مجموعہ)، قاعدے بے قاعدے (مجموعہ)
- جلیل قدوائی : چند اکابر چند معاصر
- ابراہیم جلیس : آسمان کے باشندے
- عبدالسلام خورشید : وہ سورتیں الٰہی
* * ممتاز مفتی * ضمیر جعفری * عطاء الحق قاسمی * ابوالفضل صدیقی * مرزا ظفر الحسن * مسعود اشعر * نصر اللہ خاں * مشفق خواجہ * احمد بشیر
- اعجاز حسین : ملک ادب کے شہزادے
- غلام السیدین : اہل صفا (آندھی میں چراغ)
- علی جواد زیدی : آپ سے ملیے
- مالک رام : وہ صورتیں الٰہی

1970 کے بعد اردو میں خاکہ نگاری

- خواجہ احمد فاروقی : یادیار مہربان
- صالحہ عابد حسین : جانے والوں کی یاد
- عبدالماجد دریا آبادی: ماضیات ماجدی
- جگن ناتھ آزاد : آنکھیں ترستیاں ہیں
- عوض سعید : خاکے (مجموعہ)
- اقبال متین : سوندھی مٹی کے بت (مجموعہ)
- یوسف ناظم : سائے اور ہمسائے (مجموعہ)، ذکر خیر (مجموعہ)، علیک سلیک (مجموعہ)
- مجتبیٰ حسین: آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، آپ کی تعریف (چاروں مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔)



اردو کے اہم خاکہ نگار اور ان کے خاکے

عبدالحق کا لکھا ہوا داخل نصاب خاکہ

نام دیو — مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن، کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کیا اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا، گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا

ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا۔ ان کو توانا اور تاشاد دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اس میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچالیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے اُن کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اِس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کردیا۔ شاید اس کا کہنا تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی تربیت و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی، اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہاکاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا، نہ شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلّڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔

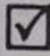
وہ بہت سادہ مزاج اور بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ

باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھے ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔



رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا داخل نصاب خاکہ

کُندن

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم و بیش 35-30 سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائے گا! طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا، گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظام فطرت میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی ''تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی!''

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آ جاتی۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر، غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء ''ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن''۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا، پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آ جاتا۔ پڑھائی کے دنوں

میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کندن کون کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لیے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا، ہجور فلاں گھنٹہ۔ چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے ہجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی گراوٹ نہیں۔

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس 35-30 سال میں ہم سے قریب ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ دیکھ لیجیے زندہ چوتوئی یا زفستق ہچومنی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی!

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کوآڈرٹیگل (کچی پکی پارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈ مقرر کیا اور کھچیرا (ایک بوڑھا مہتر) کو لانس کارپورل (Lance Corporal خواص میں یہ کمپنی Mirza Akhter Husain's won Fussiliery (مرزا اختر حسین اون فوسیلری) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفر مینا کے نام سے مشہور ہوئی۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب کندن اور یہ سفر مینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی!

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے۔ جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے سب شریک ہو جانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے۔ کوٹ کی اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو

لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے، بغل میں طرح طرح کی فائلیں۔ اور کاغذ کے پلندے ڈیسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی 'سفر مینا' جاروب بدست و کھرپا در بغل، اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہوا اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفر مینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا، دوسرا ڈیٹچ منٹ (Detachment) اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا۔

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا، یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا۔ اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ ایک د
ن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع دی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا، مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا۔ کہنے لگا حجور اطلاع کرتا تو پہلے... صاحب کے گھر والوں کو کرتا، آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ تھا! مرزا صاحب نے فوراً اس پرچہ پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی! چوزا تو ے یکے بے دانشی کردو!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیا بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفہ ؟ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابان اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا

صاحب کے جلوس شاہی کا یوم تقریب دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی زبیری کے عہد رجسٹراری تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ قصہ ختم ہوگیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضوری ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا ہجور بالکل ٹھیک ہے، کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کندن کی عملداری میں سے گزرا۔ نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جارہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا، بولا، ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی۔ دوسرے عملداری ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہوکر پٹنے چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آگیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم مئے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہوجاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا۔ تقریب کہیں کیسی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گزشتہ 40-30 سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں 'صلائے عام' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا برا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کرلیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ اور بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اور ان کی ثبات وصحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا

ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں، خورد ونوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو ہے۔

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کیسی حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آ گئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اور اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی اور کمروں کی کمی ان سب سے نپٹنے کے لیے کندن کی ''ایک شخصی وزارت'' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آ جاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کیے جا سکیں، شکر گزاری کے موجب ہوں گے، یہ خط لے کر کندن جاتا۔ پوچھتا۔ کندن کیسے کدھر آ نکلے؟ ہجور امتحان ہے نہ، کرسی ڈسک چاہیے۔ بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا۔ میاں خان (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے، اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور انکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبے جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو بھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا۔

کنووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسے گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ رات گئے تک یہ

"ہنگامہ شعر وسخن" پار ہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچادیں گے۔

جلالۃ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا۔ جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے، یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ، دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیا کو حسب منشا میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہرفن مولا نہیں تو ہرفن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہوں۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح وسالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا، اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کے کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی۔ لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا، اس کی کون نہ مانتا!

میرا خیال ہے کہ کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ

ہند سے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی انکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تاوقت کہ اس پر کامل بھروسہ نہ ہو۔ کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کر دیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آ کر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہو گئی اور بس۔

امتحان کے کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر ادھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا، کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجہ مجبوری وہ یہاں اپنی سفرینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آفریا چیلنج ان کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کی طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ انھیں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

1947 کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل و غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوس اور درماندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا۔ جو یونیورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی۔ یونیورسٹی کھلی ہو تی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا۔ پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابا

رہے گا۔ گاؤں میں کیا خبر ہے، کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ کہتا حجور کالج پر سید صاحب کی دعا ہے۔ سب کھیریت رہے گی۔ کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سید صاحب'' کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں، صورت حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری۔

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا۔

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا حجور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پرکھ بن جائیں۔ جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہو ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفس کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجا لانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس

کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں۔
عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آ کر ٹھہر گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوی شکل وصورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!
درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پائدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھے ہو اتنی محنت نہ کیا کرو تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی ''ہجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔''!
یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں وکٹوریا گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے 35-30 سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے!
ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونی فارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا، میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمہارے سائے میں بسا ہوا ہے، کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمہارے ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجا
تا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگوں اور وہاں کی راجدھانیاں الٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔
آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ ''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے یا اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس ''حرکت'' سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا۔
کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید

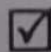
بردار رہا، یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں۔ کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بہ دن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے، ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ناقابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا۔

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل میں بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج بالکل دنیا ک

اچھا ہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نووارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے، وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورت حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم ''گزشتہ سے پیوستہ'' میں گزشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی۔

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے، یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی۔



مرزا فرحت اللہ بیگ

(1885ء۔1947ء)

- نام مرزا فرحت اللہ بیگ
- مرزا فرحت اللہ بیگ 1885ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ کا انتقال حیدرآباد میں 1947ء میں ہوا تھا۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے پہلے خاکہ نگار ہیں۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ خاکہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے کارنامے

* مضامین فرحت، حصہ اوّل تا ہفتم (مختلف مضامین کے مجموعے)
* دیوان یقین (ترتیب وتدوین مع مقدمہ)
* دیوان نظیر اکبرآبادی (ترتیب وتدوین مع مقدمہ)
* انشا، انشاء اللہ خان پر ایک کتابچہ
* چار کہانیاں: چار غیر ملکی کہانیوں کا مجموعہ
* میری شاعری، کلیات
* میری داستان، زمانہ ملازمت کے حالات

<u>متفرق مضامین</u>

(مضامین فرحت کے علاوہ وہ مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے)

* دلی کا آخری یادگار مشاعرہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کے لکھے ہوئے خاکے

مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی (یہ خاکہ مولوی وحید الدین سلیم کو ایسا پسند آیا تھا کہ انھوں نے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کی تھی) ایک وصیت کی تکمیل میں (وحید الدین سلیم کا خاکہ)

نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی

- ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اردو کا پہلا مکمل اور طویل خاکہ ہے۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا تھا۔
- چھپن صفحات پر مشتمل مرزا فرحت اللہ کا یہ پہلا مضمون ہے جو ان کے اصلی نام سے اردو ادب کے سہ ماہی رسالہ 'اردو' اورنگ آباد کی جولائی 1928 کی اشاعت میں پہلی بار شائع ہوا اور بعد میں علی گڑھ سے کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔
- فرحت اللہ بیگ نے اس خاکے میں نذیر احمد کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو ایمان داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ نے خود لکھا ہے کہ اب تک جو کچھ کانوں نے سنا اور آنکھوں نے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا چاہے کوئی برا مانے۔ جہاں مولوی صاحب کی خوبیوں کو دکھاؤں گا وہاں ان کی خامیوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے۔
- مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس خاکے میں مولوی نذیر احمد کا حلیہ، عادت واطوار کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ مولوی صاحب ہمیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔
- ''مولوی نذیر احمد کی کہانی اس ادیب شہیر کی ایک ایسی قلمی تصویر ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ اردو ادب میں مزاحِ لطیف، شوخی بیان اور حسن ظرافت کا بہترین نمونہ ہے جسے ہم مرزا صاحب کے کمالِ فن کی معراج کہہ سکتے ہیں۔'' (تنویر احمد علوی)



سفرنامے کا فن

- نقل مکانی یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کا عمل سفر کہلاتا ہے۔
- عربی میں سفر کے معنی مسافت طے کرنا یا مسافت قطع کرنے کے ہیں۔
- سفر کو کامیابی کی کنجی کہا گیا ہے۔
- خالد محمود کے مطابق سفرنامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات واحساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفرنامہ ہے۔
- سفرنامے کا تمام تر مواد مسافر کے گردوپیش میں بکھرے ہوئے مناظر وواقعات سے اخذ کیا جاتا ہے۔
- سفرنامے کے لیے کوئی خاص تکنیک، خاص ہیئت یا اسلوب وضع نہیں کیا گیا ہے۔
- فنی اعتبار سے سفرنامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں اسلوب کے نئے تجربات کی گنجائش بہت کم ہے۔
- بقول خالد محمود سفرنامہ میں ایک سیاح اپنے تجربات و مشاہدات خود بیان کرتا ہے۔ اس سے سفرنامہ ایک قسم کی آپ بیتی بھی بن جاتا ہے۔
- سفرنامے کا مرکزی کردار خود سفرنامہ نگار ہوتا ہے جو صیغۂ واحد متکلم کے ذریعہ اپنی روداد سفر بیان کرتا ہے۔

اردو میں سفرنامے کا آغاز وارتقا

- اردو کا پہلا باقاعدہ سفرنامہ نگار یوسف خاں کمبل پوش کو قرار دیا جاتا ہے۔
- یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے "تاریخ یوسفی" کو پہلا سفرنامہ قرار دیا جاتا ہے۔
- یادرہے کہ "تاریخ یوسفی" عجائبات فرنگ کے نام سے مشہور ہے یعنی عجائبات فرنگ پہلا سفرنامہ ہے۔
- یوسف خاں کمبل پوش نے 1837 میں انگلستان کا سفر کیا تھا۔ یہ سفرنامہ اسی سفر کی روداد ہے جو 1847 میں پہلی بار دہلی سے شائع ہوا تھا۔

اردو میں سفرنامے کا ارتقا

- یوسف خاں کمبل پوش: تاریخ یوسفی معروف بہ عجائبات فرنگ 1847

- نواب کریم خاں : سیاحت نامہ
- مولوی مسیح الدین علوی: سفرنامۂ تاریخ انگلستان معروف بہ سفرنامہ لندن
- سرسید احمد خاں : مسافران لندن
- مرزا اشار علی : سفرنامہ یورپ
- نواب رام پور محمد حامد علی خاں: سیر حامدی (دو جلدیں)
- شبلی نعمانی : سفرنامہ روم ومصر وشام
- محمد حسین آزاد: وسط ایشیا کی سیر، سیر ایران
- جعفر تھانیسری : تواریخ عجیب، موسوم بہ "کالا پانی"

بیسیویں صدی کے نصف اول میں اردو سفرنامہ

- نواب سلطان جہاں بیگم والی ریاست بھوپال: سیاحت سلطانی
- نواب لیاقت جنگ بہار: سفرنامہ یورپ وامریکہ، سیاحت نامہ
- عبیداللہ سندھی : کابل میں............
- سرراس مسعود: جاپان کا تعلیمی نظم ونسق
- عبدالماجد دریا آبادی: ڈھائی ہفتے پاکستان میں
- مہاراجہ کشن پرشاد: سیر پنجاب، سفرنامہ
- شیخ عبدالقادر : مقام خلافت، سیاحت نامہ یورپ
- خواجہ غلام الثقلین: سیاحت نامہ
- منشی محبوب عالم بنیادی: عجائبات یورپ، سفرنامہ بغداد
- سید سلمان ندوی : سیر افغانستان
- نشاط النسا بیگم (حسرت موہانی کی بیگم): سفرنامۂ عراق، سفرنامۂ حجاز
- قاضی عبدالغفار : نقش فرنگ

تقسیم ہند کے بعد اردو سفرنامہ

- ڈاکٹر عابد حسین : رہ نورد شوق
- صالحہ عابد حسین : سفر زندگی کے لیے سوز وساز

- سید احتشام حسین: ساحل اور سمندر
- عبادت بریلوی : ترکی میں دو سال
- سید ابوالحسن ندوی: ترکی میں دو ہفتے، شرق اور وسط میں کیا دیکھا
- ارشد القادری : دلی سے سہارن پور تک
- گوپی چند نارنگ: سفر آشنا
- خواجہ غلام السیدین: دنیا میرا گاؤں
- وزیر آغا : بیس دن انگلستان میں
- ممتاز مفتی : ہندیاترا، لبیک
- انتظار حسین : زمین اور فلک
- ابن انشا : ابن بطوطہ کے تعاقب میں، نگری نگری پھرا مسافر
- مجتبیٰ حسین : جاپان چلو جاپان چلو

قدیم روایت سے انحراف کرنے والے سفر نامہ نگار

- جمیل الدین عالی
- مستنصر حسین تارڑ
- قرۃ العین حیدر
- قدرت اللہ شہاب
- رام لال
- عطاء الحق قاسمی
- عبید اللہ ملک
- صغریٰ مہدی



اردو کے اہم سفرنامہ نگار اور ان کے سفرنامے

سرسید کے داخل نصاب سفرنامہ

مسافران لندن

- مسافران لندن سرسید احمد خاں کا سفرنامہ ہے جو قسط وار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار یعنی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مختلف شماروں میں 30/اپریل 1869 سے 11/مارچ 1870 تک شائع ہوتا رہا تھا۔
- سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن ان کی زندگی میں مکمل اور مرتب ہو کر شائع نہ ہو سکا تھا۔ البتہ سرسید نے اسے اپنی زندگی میں تہذیب الاخلاق میں دو بار شائع کرادیا تھا۔
- اس سفرنامے کا نام 'مسافران لندن' سرسید نے خود تجویز کیا تھا۔
- مسافران لندن کو مجلس ترقی ادب لاہور کے سربراہ امتیاز علی تاج کے ایما پر شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا تھا۔
- مسافران لندن کو پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور نے کتابی شکل میں 1961 میں شائع کیا تھا۔
- مسافران لندن میں سرسید نے اپنے سفر و قیام لندن کو بیان کیا ہے۔
- سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن بارہ قسطوں پر مشتمل ہے۔
- اس سفرنامہ کا خواب ناک انداز ہمیں چند بہترین سفرناموں کی یاد دلاتا ہے۔ (اخبار سینٹ جیمش 31/اکتوبر 1880)



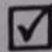
شبلی کا داخل نصاب سفر نامہ

سفرنامہ روم ومصر وشام

- سفرنامہ روم ومصر وشام شبلی نعمانی کا سفرنامہ ہے جو پہلی بار مطبع مفید عام آگرہ سے 1894 میں شائع ہوا تھا۔
- شبلی 1892 میں روم، مصر اور شام کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور اسی سال واپس ہو گئے تھے۔
- شبلی نے اپنے بزرگوں اور دوستوں کی فرمائش پر 1893 میں سفرنامہ لکھنا شروع کیا تھا۔
- سفرنامہ روم ومصر وشام میں شبلی نعمانی نے ترکی، شام اور مصر کے مسلمانوں کے علمی، تعلیمی، اخلاقی اور تمدنی حالات اور دیگر وقائع سفر اور حوادث سیاحت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔
- سفرنامہ کی ابتدا میں شبلی کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس میں انھوں نے سفرنامہ لکھنے کی وجہ اور ان باتوں اور واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جو انھوں نے سفرنامہ میں قلم بند کیے ہیں۔
- شبلی نعمانی نے سفرنامہ روم ومصر وشام میں مندرجہ ذیل سرخیاں قائم کی ہیں:

سفر کا ارادہ وآغاز، قصیدہ، قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ ومختصر حالات، ترقی تعلیم کالج اور اسکول، مکتب حربید، مکتب سلطانی، مکتب ملکیہ، قدیم تعلم اور مدارس قدیمہ، ترکوں کی علمی حالت، چھاپا خانے، کتب خانے، زوایا یا خانقاہیں، مساجد جامع اور مشہور مقامات، سیر گاہیں، محرم، سلاملق باموبک سلطانی اور عیدالاضحیٰ، ترکوں کے اخلاق و عادات وطرز معاشرت، قسطنطنیہ میں ہندستانی، قسطنطنیہ کے احباب، غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغہ مجیدیہ کا عطا ہونا، قسطنطنیہ سے روانگی 26 محرم 1309ھ، بیروت، بیروت سے روانگی، بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، قمامہ، علما وفضلا کی ملاقات اور دیگر حالات، بیت المقدس سے روانگی، قاہرہ کا اجمالی حال مصر میں تعلیم کی حالت، بقیہ کالج اور اسکول، قدیم تعلیم مع ازہر، کتب خانہ خدیو، قدیم یادگاریں اور قابل سیر مقامات، مطابع واخبارات، حال کی عربی زبان۔

- یاد رہے کہ ان سرخیوں کے ماتحت بھی کئی ذیلی سرخیاں ہیں۔



ابن انشا

- ابن انشا کا نام شیر محمد خان تھا اور تخلص انشا۔
- ابن انشا جالندھر کے ایک گاؤں میں 15 رجون 1927 کو پیدا ہوئے تھے۔
- ابن انشا کا انتقال 11 رجنوری 1978 کو لندن میں ہوا تھا اور کراچی میں دفن کیے گئے تھے۔
- ابن انشا نے جامعہ پنجاب سے بی۔اے 1946 میں اور کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے 1953 میں کیا تھا۔
- ابن انشا 1962 میں نشنل بک کونسل کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تھے۔
- ابن انشا ٹوکیو بک ڈولیمنٹ پروگرام کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگرام ٹوکیو کی رکزی مجلس ادارت کے رکن تھے۔
- ابن انشا نے یونیسکو کے مشیر کی حیثیت سے متعدد یورپی و ایشیائی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ جن کا احوال اپنے سفرناموں میں اپنے مخصوص طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔

انشا کے کارنامے

شاعری: * اس بستی کے اک کوچے میں 1976 * چاند نگر
* دل وحشی * بلو کا بستہ (بچوں کے لیے نظمیں)

سفرنامے: * آوارہ گرد کی ڈائری * دنیا گول ہے۔
* ابن بطوطہ کے تعاقب میں * چلتے ہو تو چین کو چلیے
* نگری نگری پھرا مسافر

مضامین: * آپ سے کیا پردہ * خمار گندہ
* اردو کی آخری کتاب

ابن انشا کا داخل نصاب سفر نامہ

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

- ابن بطوطہ کے تعاقب میں ابن انشا کا چوتھا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے جرمنی، لندن، جاپان، لنکا اور ایران کے سفرنامے کو شامل کیا ہے۔

c ابن بطوطہ میں شامل سفرناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

جرمنی ولندن (نومبر 1971): *ایک ہدات نامہ پیارے ہم وطنوں کے لیے * پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ * ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں *چند خطوط— سراسر ذاتی * پھر وہی لندن، پھر وہی ہم ☆ وہ دکان اپنی بڑھا گئے * وہ بھی خیریت سے ہیں، ہم بھی * آوارہ گردکی واپسی

جاپان (جولائی 1972): *وطن کی آگ، پردیس کی برکھا، * ضرورت ہے ایک گدھے کی * کہا جاپان کو جائیں، کہا جاپان کو جاؤ * خودکشی ان کی اور ہماری * جوتے کا مقام ہمارے معاشرے میں

فلپائن (دسمبر 1972): * جانا ملک سے باہر اور رہنا قدر ہماری * منیلا میں ہم ملک الشعرا ہوتے ہوتے رہ گئے * ایک اور خط منیلا سے

جاپان (جولائی 1973): * ہم تو سفر کرتے ہیں * ٹوکیو سے ایک اور خط * تم آؤ گے تو کیا لاؤ گے * جاپان کشتی صاحب کا

جاپان (جنوری 1974): * جاپان جایئے تو لالٹین لے کے جایئے * اب گھوڑوں کی ضرورت ہے * کچھ بھاؤ آٹے دال کا

لنکا (جنوری 1964): *ابن بطوطہ کے تعاقب میں * سواد شہر کولمبو * چھڑی کی تلاش میں * سودیشی ریل سے ایک سفر * لنکا کے لاہور کینڈی میں *دانت کے درشن * جنت میں گمشدگی * بارے ہاتھ کا کچھ بیان ہو جائے

ایران (دسمبر 1963): * فادر کرسمس کی روانگی * مسائل خورد ونوش * دو گھنٹے حبس بیجا میں * آقائے ابن انشا خریداری کو نکلے * تاریخ کی گلیوں میں * شیراز اور کنار آب رکناباد * تخت جمشید کے خرابوں میں * اصفہان و اصفہانیات * رہبر بھی ملا تو مرتضےٰ تکوئی * جامع مسجد اور حمت اللہ * ذرا مینار لرزاں تک * حادثہ منوچہری اسٹریٹ کا * رے— نگری امام رازی کی * شاہ عبدالعظیم سے مینار طغرل تک



Unit-9

اردو کے ادبی دبستان، ادارے
اور تحریکات ورجحانات

(1) دبستانِ دہلی

- دہلویت، ایک نقطۂ نظر یا ایک افتادِ طبع یا ایک مزاجِ شعری کا نام ہے جسے لکھنویت سے مقابلہ کر کے سمجھا جاسکتا ہے۔
- دبستانِ دہلی کی وہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں جن سے دبستانِ دہلی سے تعلق رکھنے والے شعرا کو پہچانا جاسکتا ہے۔
- دبستانِ دہلی میں داخلیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف اور اخلاق کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔
- دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں طرز بیان سادہ اور سلیس ہوتا ہے۔
- دبستانِ دہلی میں الفاظ سے زیادہ خیالات کی صفائی اور پاکیزگی پر زور دیا جاتا ہے۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں معاملات اور واقعات سچے اور اصلی ہوتے ہیں۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں جذبات حقیقی ہوتے ہیں اس لیے سوز و گداز کافی ہوتا ہے۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں آمد کی کیفیت سارے کلام میں نظر آتی ہے۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں مختصر غزلیں ہوتی ہیں جنھیں سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔
- دبستانِ دہلی کے شعرا کے یہاں زبان مردانہ ہے۔ محبوب بھی بعض جگہوں پر مرد ہی نظر آتا ہے۔
- دبستانِ دہلی میں وصال سے زیادہ ہجر کی طلب نظر آتی ہے۔
- دبستان دہلی میں ابتذال یعنی عریاں نگاری سے پرہیز کیا جاتا ہے۔
- دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصنع اور بناوٹ سے گریز نظر آتی ہے۔
- میر کے حساب سے میر کے زمانے میں پونے تین شاعر دہلی میں موجود تھے۔
- میر نے خود کو اور سودا کو مکمل شاعر، درد کو آدھا شاعر اور سوز کو پاؤ شاعر کہا ہے۔

دبستانِ دہلی کے شعرا

* میر تقی میر	* مرزا رفیع سودا	* درد	* سوز
* نصیر	* مرزا غالب	* مومن	* ذوق
* ظفر	* مصطفیٰ خان شیفتہ (گلشن بے خار)		* حالی
* محمد حسین آزاد	* داغ دہلوی		

(2) دبستانِ لکھنؤ

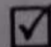
- دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات سے مراد وہ خصوصیات ہیں جن کو لکھنؤ کے شاعروں نے اختیار کیا۔
- دبستانِ لکھنؤ کی وہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں جن سے دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے شعرا کو پہچانا جا سکتا ہے۔
- دبستانِ لکھنؤ میں خارجیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔
- دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے یہاں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔
- دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے یہاں تصنع اور بناوٹ خوب ہے۔
- دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے یہاں رعایت لفظی، ضلع جگت، تشبیہ واستعارے کا پر تکلف استعمال ملتا ہے۔
- دبستان لکھنؤ کے شعرا نے جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوار نے اور زبان میں لطافت پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔
- دبستان لکھنؤ کے شعرا کے یہاں عریانیت، فحش گوئی، نسائیت اور جنس زدگی نظر آتی ہے۔
- دبستان لکھنوی کے شعرا کے یہاں معاملہ بندی اور مبالغہ آرائی زیادہ نظر آتی ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا

* انشا * جرأت * مصحفی * ناسخ
* آتش * انیس * دبیر * میر حسن
* دیا شنکر نسیم * مرزا شوق لکھنوی * جعفر علی حسرت * منیر شکوہ آبادی

دہلی کے وہ شعرا جو لکھنؤ چلے آئے تھے

* میر تقی میر * مرزا رفیع سودا * سوز * میر حسن
* آرزو * جرأت * انشا * مصحفی
* میر ضاحک * رنگین



(3) فورٹ ولیم کالج

آغاز و خاتمہ

- فورٹ ولیم کالج انیسویں صدی کا ادارہ تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کی بنیاد انگریز گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے 10 جولائی 1800ء مطابق 17 صفر 1215ھ کو رکھی تھی۔
- اسی دن کالج کے قواعد و ضوابط بھی تیار و منظور کر دیے گئے تھے اور ساتھ ہی ابتدا میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ گورنر جنرل کے حکم خاص سے ٹیپو سلطان کی شکست اور انگریزوں کی شاندار فتح (4 مئی 1799ء) کی پہلی سالگرہ کی یادگار کے طور پر کالج کے قیام کی تاریخ 4 رمئی 1800ء درج کی جائے۔
- اسی لیے فورٹ ولیم کالج کی قیام کی تاریخ 4 رمئی 1800ء مانا جاتا ہے۔
- فورٹ ولیم کالج کی ابتدا اورینٹل سیمنری سے ہوئی تھی جو گل کرسٹ کی سربراہی میں 1799ء میں قائم کیا گیا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اورینٹل سیمنری بند کر دیا گیا تھا۔
- ولزلی کو کالج قائم کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے کورٹ آف ڈائرکٹر سے اس کی پینشن کی منظوری بھی نہیں لی تھی۔
- جب یہ مسئلہ کورٹ کے سامنے آیا تھا تو کورٹ نے 15 رجون 1802ء کو فورٹ ولیم کالج بند کرنے اور اورینٹل سیمنری چالو کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔
- 1800ء میں کالج کے قیام کے وقت ولزلی نے کالج کے مقاصد میں مشرقی زبانوں کے علاوہ قانون، تاریخ، سائنس، مذہبیات، تجارت اور یورپ کی جدید زبانوں کی تعلیم بھی شامل کی تھی۔
- 1802ء میں ولزلی کے حکومت انگلستان کو بھیجے ہوئے خط کے بعد کورٹ نے کالج کو تو بحال رکھا تھا مگر کالج کو صرف علوم شرقیہ اور دیسی زبانوں کی تعلیم کے لیے مخصوص و محدود کر دیا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کو لارڈ ڈلہوزی کے حکم سے 24 رجنوری 1854ء کو بند کیا گیا تھا۔

مقصد

- فورٹ ولیم کالج کے پیش نظر اساسی مقصد انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبان اور تہذیب و تمدن سے واقف کرانا تھا۔

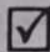
فورٹ ولیم کالج سے متعلق دیگر اہم معلومات

- فورٹ ولیم کالج رائٹرز بلڈنگ کلکتہ میں قائم کیا گیا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کا پہلا ٹرم 6رفروری 1801ء کو شروع ہوا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل اور نائب پرنسپل کے منصب کو پرووسٹ اور نائب پرووسٹ کا نام دیا گیا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کے پرووسٹ یعنی پرنسپل اور نائب پرووسٹ یعنی نائب پرنسپل ہونے کے لیے چرچ آف انگلینڈ کا پادری ہونا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی کالج کی پرنسپل صرف پادری ہی بن سکتا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کے تمام طلبہ کے لیے آسمانی عبادت (Divine Service) لازمی قرار دی گئی تھی۔
- فورٹ ولیم کالج کا پرووسٹ (پرنسپل) پادری ریورنڈ ڈیوڈ براؤن تھا۔
- عام خیال یہی رہا ہے کہ گل کرسٹ کالج کا پہلا پرنسپل تھا۔ لیکن محمد عتیق صدیقی کی تحقیقات نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ گل کرسٹ شعبۂ اردو کا پروفیسر تھا۔ پرنسپل ایک پادری ریورنڈ ڈیوڈ براؤن تھا۔ (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از سلیم اختر صفحہ 148)
- فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پہلے پروفیسر و صدر جان گل کرسٹ تھے۔
- ولزلی نے جان گل کرسٹ کو شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر 18راگست 1800ء کو مقرر کیا تھا اور وہ 23 فروری 1804ء تک ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر رہے تھے۔
- گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد شعبۂ ہندوستانی کا دوسرا پروفیسر کپتان جیمس مویٹ کو ان کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ (تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 516، جلد سوم)
- کپتان جیمس مویٹ کے بعد ان کی جگہ پر ولیم ہنٹر کو 22 فروری 1808 کو شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ (تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی، صفحہ 517، جلد سوم)
- کپتان جان ولیم ٹیلر کا تقرر صدر و پروفیسر شعبۂ ہندوستانی کی حیثیت سے 23 فروری 1808 کو ہوا تھا جہاں وہ مئی 1823ء تک رہے تھے۔
- فورٹ ولیم کالج سے وابستہ انگریز پروفیسرز اور اساتذہ: جان گل کرسٹ، جیمس مویت، ولیم ہنٹر، کپتان جان ولیم ٹیلر، ٹامس روبک
- فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پہلے میر منشی میر بہادر علی حسینی تھے۔
- اردو فارسی شعبے کا پہلا نائب میر منشی ایک بنگالی ہندو 'ترنی چندر مترا' تھا۔

- ہندوستانی کے شعبے کے لیے اس زمانے کے چودہ نامور اردو ہندی ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔
- پروفیسر عربی جون بیلی کی تنخواہ سولہ سو روپے ماہوار تھی اور ایک ہزار روپے اسے عربی مترجم کی حیثیت سے بھی ملتا تھا۔
- گل کرسٹ کی تنخواہ سو روپے اور میر امن کی چالیس روپے ماہوار تھی۔
- فورٹ ولیم کالج میں میر منشی کو دوسو روپے، نائب میر منشی کو 80 روپے، منشی کو 40 روپے اور نائب منشی کو 30 روپے ماہوار دیے جاتے تھے۔

(تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 410، جلد سوم)

- 1802 میں شعبۂ ہندوستانی کے عملے کی تعداد 48 تک پہنچ گئی تھی۔
- فورٹ ولیم کالج نے میر کی کلیات 1811ء میں میر حسن کی مثنوی سحرالبیان 1802ء میں اور دیوان سوز 1810ء میں نئے ٹائپ میں شائع کیا تھا۔
- میر شیر علی افسوس کی کتاب 'باغ اردو' جو گلستانِ سعدی کا اردو ترجمہ ہے فورٹ ولیم کالج کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔
- فورٹ ولیم کالج میں جتنے منشی ملازم ہوئے تھے ان میں صرف شیر علی افسوس اور مظہر علی خان ولا قابل ذکر شاعر تھے۔



فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنّفین (تعارف وخدمات)

جان گل کرسٹ

- گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ تھا۔ (1759-1841ء)
- گل کرسٹ ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) کا باشندہ تھا۔
- گل کرسٹ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا۔
- گل کرسٹ نے طب کی تعلیم ایڈنبرا یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔
- گل کرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر ہندوستان آیا تھا۔
- گل کرسٹ نے لغت وقواعد پر تین جلدوں میں اپنی تصنیف پیش کر کے اپنے دور میں لغت اور

قواعد کے میدان میں سب سے اہم کام کیا ہے۔

- ولزلی کی تحریک پر گل کرسٹ نے رائٹرز بلڈنگ کلکتہ ملی 'اورینٹل سیمی نری' کے نام سے 1799ء میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں تو اردملازمینِ کمپنی کو ہندوستانی و فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔
- 27 مئی 1800ء کو یہ مدرسہ بند کر دیا گیا تھا اور ولزلی نے اس کی جگہ فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔
- ولزلی نے گل کرسٹ کو شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر 18/ اگست 1800ء کو مقرر کیا تھا۔
- گل کرسٹ نے صرف چار سال فورٹ ولیم کالج میں خدمات انجام دی تھیں۔
- فورٹ ولیم کالج آ کر گل کرسٹ نے کالج کونسل کی اجازت کے بغیر بارہ کتابیں تیار کرائی تھیں اور کلکتہ کے مختلف چھاپہ خانوں میں بانٹ دی تھیں، تا کہ وہ جلد از جلد انھیں طبع کر دیں۔
- گل کرسٹ نے کتابوں کی اشاعت کے لیے 'ہندوستانی پریس' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔
- گل کرسٹ نے مشرقی زبانوں کی طباعت کے لیے یورپی اصولوں کو سامنے رکھ ٹائپ میں بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔
- گل کرسٹ ہندوستانی کے لیے رومن رسم الخط کا حامی تھا۔
- گل کرسٹ نے رومن رسم الخط میں بھی ایسی تبدیلیاں کی تھیں جن سے اردو/ ہندی کی مخصوص آوازیں واضح کی جا سکتی تھیں۔
- جو احسان ولی نے اردو شاعری پر لیا تھا وہی احسان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔" (مولوی عبدالحق)
- ہندوستانی کو طباعت کی سطح پر جدید دور میں داخل کرنے کا کام گل کرسٹ نے کیا تھا۔
- گل کرسٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے اردو زبان کو سرکاری زبان بنائے جانے کی تجویز پیش کی تھی۔
- گل کرسٹ کے انگلستان لوٹ جانے کے بعد اسی کے تجویز پر عمل کرتے ہوئے 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی تھی۔
- 'ہندوستانی زبان' کی جو کتابیں گل کرسٹ نے لکھوائی تھیں ان کی تعداد کم و بیش ساٹھ تھی۔ (تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 415 جلد سوم)
- گل کرسٹ نے خرابیِ صحت کی بنیاد پر 23 فروری 1804ء کو استعفا دیا تھا۔
- ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان میں Oriental Institute یعنی ادارۂ شرقیہ میں گل کرسٹ کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا تھا۔

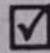
- گل کرسٹ انگریزی زبان کا شاعر بھی تھا۔اس کی نظمیں عبادت بریلوی نے مرتب وشائع کر دی ہیں۔
- ہندوستان میں قیام کے دوران (1782-1804ء) گل کرسٹ نے 'ہندوستانی' یعنی 'اردو' زبان سے متعلق سترہ کتابیں لکھی تھیں (تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 417 جلد سوم)

گل کرسٹ کی کتابیں

* اے ڈکشنری، انگلش اینڈ ہندوستانی
* انگریزی ہندوستانی لغت: اس لغت میں انگریزی لفظ کے اردو معنی رومن و اردو رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں۔ ہر لفظ کی اصل اس لغت میں بتائی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔
* اے گرامر اوف دی ہندوستانی لینگویج: اس میں گلکرسٹ نے ہندوستانی زبان کی قواعد اور صرف ونحو کے اصول، زبان سیکھنے اور سکھانے کے لیے بیان کیے ہیں۔
* اپینڈکس: یہ تالیف گل کرسٹ کی لغت اور قواعد کا ضمیمہ ہے۔جس میں معنی رومن رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں۔
* دی اورینٹل لنگوسٹ: اس میں عام فہم زبان میں ہندوستان کی مقبول عام زبان کا تعارف کرایا گیا ہے۔اردو زبان سیکھنے کا آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کی فرہنگ بھی شامل ہے اس میں آلات جنگ کے اردو نام بھی دیے گئے ہیں۔
* دی اینٹی جارگونسٹ: اس میں پہلے ہندوستانی زبان کے موضوع پر مقدمہ لکھا گیا ہے اور پھر متعدد الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں۔
* اے نیو تھیوری اوف پرشین وربز: اس میں افعال و مصادر فارسی اور ان کے ہندوستانی و انگریزی مترادفات دیے گئے ہیں۔
* ہندوستانی ایکسر سائزیز: فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کے پہلے اور دوسرے امتحانات کے لیے مشقیں فراہم کی گئی ہیں۔
* دی اسٹرینجرس ایسٹ انڈیا ٹو دی ہندوستانی اور گرینڈ لینگویج آف انڈیا امپرو پرلی کالڈ مورس: انگریزی دانوں کے لیے ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیے یہ مفید ورہنما کتاب ہے۔
* دی ہندوستانی ڈائریکٹوری اور اسٹوڈنس انٹروڈکٹر ٹو دی ہندوستانی لینگویج: اس میں اصول تلفظ و صحیح قرأت اور علم ہجا و اصول املا کی وضاحت کی گئی ہے۔
* دی ہندوستانی پرنسپلس: اس میں طلبہ کے لیے ہندوستانی قواعد کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

* پریکٹیکل آؤٹ لائنز اور اے اسکیچ اوف ہندوستانی اور تھوئے پی اس میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کے صحیح تلفظ کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔
* ہندوستانی عربیک مرر: اس میں وہ عربی الفاظ جمع کیے گئے ہیں جو ہندوستانی زبان میں مستعمل ہیں اور جن کا جاننا طلبہ کے لیے ضروری ہے۔
* دی ہندوستانی مین ول اور دی کاس کیٹ اوف انڈیا:

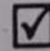
یہ کتاب کالج کے طلبہ کی نصابی ضرورت کے لیے اردو دیوناگری رسم الخط میں، کالج کے منشیوں کی مدد سے مرتب کی گئی تھی۔
* دی ہندی رومن اور تھوئے پی گرافیکل الٹی میٹم: اس میں مشرق اور مغرب کی زبانوں کے صوتی نظام کے اصولوں کو منظم طریقے سے بیان کر کے زبان مشرق یعنی 'ہندوستانی' کے عملی اصول بیان کیے گئے ہیں۔
* دی ہندی اسٹوری ٹیلر:
* دی اورینٹل فیبولسٹ: اس میں حکایات لقمان کو ہندوستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا اور سنسکرت میں ترجمہ کر کے انھیں رومن رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔
* دی مورل پری سیپٹر اور اخلاق ہندی: اس میں پند نامۂ سعدی کا منظوم انگریزی ترجمہ شامل ہے۔
* قاعدۂ ہندی ریختہ عرف رسالہ گل کرسٹ:



میر امن دہلوی

میر امن کی کتابیں:

- باغ و بہار اشاعت 1804
- گنج خوبی: اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے۔



شیر علی افسوس

(1747-1809)

- نام شیر علی جعفری تھا اور تخلص افسوس۔
- افسوس کے والد کا نام سید علی مظفر خان تھا۔

- فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے لیے لکھنؤ میں رئیس فخر الدین احمد خان عرف مرزا جعفر نے شیر علی افسوس کا نام تجویز کر کے سفارش کی تھی۔
- کرنل اسکاٹ نے افسوس کا دوسو روپیہ ماہوار پر تقرر کیا تھا۔
- میر شیر علی افسوس کا تقرر فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں 15/اکتوبر 1800ء کو ہوا تھا۔
- میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی کے استعفا کے بعد 1804ء میں میر منشی بنائے گئے تھے۔
- میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں اصطلاح اور نظر ثانی کے کام پر مامور تھے۔
- میر شیر علی افسوس کالج سے چھپنے والے مسودات کے زبان و بیان درست کرتے، جملوں میں ربط پیدا کرتے، بعض عبارتوں کو نئے سرے سے لکھنے اور اعراب سے ان کے تلفظ کو سہل بنا کر طباعت کے لیے تیار کرتے تھے۔
- میر شیر علی افسوس کے اصلاح و نظر ثانی کردہ کتابوں میں 'نثر بے نظیر' از میر بہادر علی حسینی، قصۂ بکاولی (مذہب عشق) از نہال چند لاہوری، مادھونل اور کام کندلا از مظہر علی خان ولا، تو تا کہانی از حیدر بخش حیدری، قصہ حاتم (آرائش محفل) از حیدر بخش حیدری، قصۂ چہار درویش (باغ و بہار) از میر امن دہلوی، شامل ہیں)۔
- افسوس نے میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کو اپنے دیباچے کے ساتھ مرتب کیا تھا اور 'کلیاتِ سودا' کی تصحیح بھی کی تھی۔

میر شیر علی افسوس کی کتابیں

* افسوس کے تالیفی و تخلیقی کاموں میں (i) باغ اردو (ii) آرائش محفل (3) کلیاتِ افسوس شامل ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی دو کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے ہے۔
* باغ اردو 1215ء: یہ شیخ سعدی کی تصنیف 'گلستان' کا اردو ترجمہ ہے جس میں نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا ترجمہ نظم میں کیا گیا ہے۔
* باغ اردو نہ صرف نثر میں افسوس کی پہلی کتاب ہے بلکہ فورٹ ولیم کالج کی بھی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔
* باغ اردو میر شیر علی افسوس نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھی تھی۔
* آرائش محفل: اسے افسوس نے پروفیسر جون ہارنگٹن کی تجویز پر 1805ء میں لکھی تھی۔
* 'آرائش محفل' میں سبحان رائے کی تاریخ 'خلاصۃ التواریخ' کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ باغ اردو کی طرح یہ ترجمہ نہیں ہے۔

حیدر بخش حیدری

- سید حیدر بخش حیدری (وفات 1823ء) شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔
- حیدر بخش حیدری نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار اور ملازمت کے خیال سے قصہ 'مہر و ماہ' لکھ کر میر بہادر علی حسینی کے توسط سے گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔
- گل کرسٹ نے حیدری کو 4 مئی 1801ء کو چالیس روپے ماہوار پر بحیثیت منشی ملازم رکھا تھا۔
- فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مترجم حیدر بخش حیدری ہیں۔
- حیدری کی تالیفات کی ترتیب واشاعت کا سب سے زیادہ کام ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کیا ہے۔

حیدری کی کتابیں

(1) **قصہ مہر و ماہ 1214ھ**: یہ اردو نثر میں حیدری کا پہلا کام ہے جو انھوں نے گل کرسٹ کو پیش کیا تھا۔

- عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ مہر و ماہ کی نثر پر کالج کے نثری معیار کا واضح اثر نہیں ہے۔

(2) **قصہ لیلیٰ مجنوں**: 1801ء میں گل کرسٹ کے کہنے پر حیدری نے اسے محاورۂ اردوئے معلّیٰ میں لکھ کر تیار کیا تھا۔

(3) **توتا کہانی**: حیدری نے یہ اردو ترجمہ سید محمد قادری کی کتاب 'طوطی نامہ' سے کیا ہے جس کا ماخذ طوطی نامی ضیاء الدین نخشبی ہے۔

- نوٹ: یہاں پہلی بار اردو میں لفظ 'طوطا' 'ت' سے لکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ حیدری نے یہ بتائی ہے کہ ہندی میں حرف 'طوے' نہیں ہے۔ (تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 467 جلد سوم)
- توتا کہانی میں توتا ہر رات ایک کہانی سناتا ہے۔
- گارسین دتاسی نے لکھا ہے کہ 'توتا کہانی' کا بنیادی قصہ سنسکرت زبان کی تالیف 'شک سپ تی' سے ماخوذ ہے۔ (صفحہ 467 جمیل جالبی)

(4) **آرائش محفل 1801**: یہ فارسی قصہ حاتم طائی سے ماخوذ ہے۔

- میر امن کے باغ و بہار کے بعد آرائش محفل بھی اردو کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

(5) **گل دستہ حیدری**: یہ تین متفرق کتابوں کا مجموعہ ہے۔

(6) مختصر کہانیاں

(7) **گلشن ہند**: یہ حیدری کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ہے جسے عبادت بریلوی نے مرتب

کر کے 1968 میں اپنے پیش لفظ ومقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

(8) **جامع القوانین**

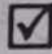
(9) **گلزار دانش:** حیدری نے بہار دانش نامی فارسی داستان کا ترجمہ اردو میں گلزار دانش کے نام سے 1218ھ میں مکمل کیا تھا۔

(10) **ہفت پیکر:** یہ نظامی کی فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔

(11) **تاریخ نادری:** حیدری نے 'تاریخ جہاں کشائے نادری' نامی فارسی تاریخی کتاب کا اردو میں ترجمہ ولیم ٹیلر کی فرمائش پر کیا تھا۔

(12) **گل مغفرت:** یہ ملا واعظ حسین کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔

(13) دیوان حیدری



نہال چند لاہوری

- نہال چند لاہوری شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اور پھر لاہور میں جا بسے تھے۔
- نہال چند لاہوری ڈیوڈ رابرٹ سن کے توسط سے گل کرسٹ تک پہنچے تھے۔
- نہال چند لاہوری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر تاج الملوک اور بکاؤلی کے فارسی زبان میں لکھے ہوئے قصے کو اردو نثر میں ڈھال کر 'مذہب عشق' نام رکھا تھا۔
- مذہب عشق نہال چند لاہوری کی طبع زاد نہیں ہے۔
- نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج میں کسی منصب پر فائز نہیں تھے۔



میر بہادر علی حسینی

- میر بہادر علی حسینی کا پورا نام میر بہادر علی حسینی ترمذی تھا۔
- میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پہلے چیف منشی کی حیثیت سے دو سو روپے ماہوار پر 4 رمئی 1801ء میں وابستہ ہوئے تھے۔
- میر بہادر علی حسینی کے کالج سے وابستہ ہونے کے وقت میر شیر علی افسوس وہاں پہلے سے بحیثیت مترجم کام کر رہے تھے۔

- میر بہادر علی حسینی نے 1804ء میں میر منشی کے عہدے سے استعفا دیا تھا۔

میر بہادر علی حسینی کی کتابیں

- میر بہادر علی حسینی ترمذی نے فورٹ ولیم کالج کے لیے چار کتابیں ترجمہ وتالیف کی تھیں۔

(1) نثر بے نظیر: اس میں حسینی نے میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کے قصے کو نثر کیا ہے۔ نثر بے نظیر کو حسینی نے دو طرح سے لکھا تھا:

- پہلا روپ 'نثر بے نظیر' کو (قلمی) 'عام کی بولی میں'
- دوسرا روپ 'نثر بے نظیر (مطبوعہ 1803ء)' موافق محاورۂ خاص کے'
- اس دوسرے روپ پر میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی تھی۔

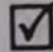
(2) **اخلاق ہندی**: یہ فارسی زبان کی تالیف مفرح القلوب کا اردو ترجمہ ہے جسے تاج الدین مفتی الملکی نے صوبہ بہار کے ملک الملوک نصرۃ الدولۃ کے حکم سے سنسکرت سے فارسی میں کیا تھا۔

➢ مفرح القلوب سنسکرت زبان کی تصنیف ہتوپدیش کا ترجمہ ہے اور ہتوپدیش 'پنچ تنتر' سے ماخوذ ہے۔

(3) نقلیات ہندی: نقلیات دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 108 اور دوسرے حصے میں 92 نقلیات ہیں۔

(4) تاریخ آشام (آسام): یہ جے کے ہارنگٹن اور ایچ ٹی کول بروک کی فرمائش پر 1805ء میں لکھا گیا تھا۔

- ان تراجم وتالیفات کے علاوہ میر بہادر علی حسینی، مولوی امانت اللہ، مولوی فضل اللہ اور کاظم علی جوان کے ساتھ قرآن مجید کے ترجمے میں بھی شریک تھے۔



مظہر علی خاں ولا

- نام مظہر علی خاں (وفات 1816ء)، تخلص ولاؔ اور عرفیت لطف علی تھی۔
- مظہر علی خان ولا کے والد کا نام سلیمان قلی خان وداد تھا جو فارسی کے مشہور شاعر تھے۔
- ولاؔ اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔
- شاعری میں ولاؔ میر نظام الدین ممنون، مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے۔
- نواب فخر الدین احمد خان عرف مرزا جعفر کی سفارش پر مسٹر اسکاٹ نے فورٹ ولیم کالج کے لیے

مظہر علی خان ولا کا تقرر 10 نومبر 1800ء کو کیا تھا۔

مظہر علی خان ولاؔ کی کتابیں

(1) **مادھونل اور کام کنڈلا:** گل کرسٹ کی فرمائش پر ولاؔ نے للولال کوی کی مدد سے 1801ء میں برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

(2) **بیتال پچیسی:** ولاؔ نے اسے بھی برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

(3) **ہفت گلشن:** یہ ولا کا تیسرا ترجمہ ہے جو انھوں نے گل کرسٹ کی فرمائش پر کالج کے لیے کیا تھا۔ ہفت گلشن، ناصر علی خان بلگرامی واسطی کی فارسی تصنیف ہے۔ جس میں نصائح کے طور پر 'حکایات' جمع کی گئی ہیں۔

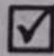
(4) **لطائف وظرائف:** گل کرسٹ کی فرمائش پر ولاؔ نے لطائف وظرائف کا ترجمہ لطائف وظرائف کے نام سے کیا تھا۔

(5) **تاریخ شیر شاہی:** کپتان جیمس مویت کی تجویز پر ولاؔ نے عباس خان سروانی کی فارسی تالیف 'تاریخ شیر شاہی' کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

(6) **تاریخ جہانگیر شاہی:** ولاؔ نے تاریخ شیر شاہی کے بعد ولیم ہنٹر کی فرمائش پر 'اقبال نامۂ جہانگیری' کا ترجمہ 1809ء میں تاریخ جہانگیر شاہی کے نام سے کیا تھا۔ اس میں شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات وواقعات درج ہیں۔

(7) **پند نامہ:** ولاؔ نے شیخ سعدی کے پند نامہ کا ترجمہ 1802ء میں کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کو ولاؔ نے جے کے ہارنگٹن کی نذر کیا تھا۔

(8) **دیوانِ ولا:** ولا نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے اپنے 'دیوان' کو مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا اور 1810ء میں اسے مدون کر کے پروفیسر ہٹلر کو پیش کیا تھا۔



کاظم علی جواںؔ

- کاظم علی جواں کا اصل نام حسن علی خاں اور عرفیت مرزا کاظم علی تھی۔ شاعری میں جواںؔ تخلص رکھتے تھے۔
- کاظم علی جواں کا تقرر شعبۂ ہندوستانی میں بحیثیت مترجم نومبر 1800ء میں ہوا تھا۔

کاظم علی جواںؔ کی کتابیں

(1) شکنتلا: کالج سے وابستہ ہونے کے دوسرے ہی دن گل کرسٹ نے جواںؔ سے شکنتلا کے قصے کو اردو میں لکھنے کا کام سپرد کیا تھا جسے جواں نے للولال کوی کی مدد سے 1801ء میں برج بھاشا سے اردو میں لکھا تھا۔

(2) سنگھاسن بتیسی: جواںؔ نے گل کرسٹ کی فرمائش پر 1801ء میں اسے برج بھاشا سے اردو میں لکھا تھا۔

(3) ترجمۂ قرآن مجید: سنگھاسن بتیسی کے بعد گل کرسٹ کی فرمائش پر جواںؔ نے میر منشی بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ کے ساتھ قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

(4) بارہ ماسا/ دستور ہند: جواںؔ کا 'بارہ ماسا' مثنوی کی ہیئت میں ہے اور 'دستور ہند' اس کا نام ہے۔ اسے جواںؔ نے گل کرسٹ کی فرمائش پر 1803ء میں مکمل کیا تھا۔

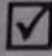
- یہ طبع زاد نظم ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے رسم ورواج، میلے ٹھیلوں، کھیل تماشوں اور تہواروں کو بیان کیا گیا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام 'دستورِ ہند' رکھا ہے۔
- تاریخ بہمنی: جواں نے 'تاریخ فرشتہ' کے اس حصے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس میں بہمنی سلطنت کے حالات وواقعات بیان کے گئے تھے۔
- جواں نے مولوی محمد اسلم منشی غلام قادر اور مرزا جان طپش کے ساتھ مل کر کیا تھا جو 1811 میں کالج سے شائع ہوا تھا۔
- شیخ فریدالدین کی 'خردافروز' پر بھی 1815 میں کاظم علی جواں نے منشی غلام اکبر بیگ اور غلام قادر کے ساتھ اصل فارسی نسخے سے ملا کر نظر ثانی کا کام کیا تھا۔



حفیظ الدین احمد

- شیخ حفیظ الدین احمد شیخ ہلال الدین احمد کے بیٹے تھے۔
- حفیظ الدین احمد شعبۂ فارسی میں بحیثیت منشی کام کرتے تھے۔
- حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج سے چار مئی 1801 کو وابستہ ہوئے تھے۔
- حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج سے سبکدوش ہوکر ریزیڈنٹ دہلی مسٹر مٹکاف کے دفتر میں صدر منشی کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے۔

- حفیظ الدین احمد نے 'عیار دانش' کا اردو ترجمہ 1803 میں 'خرد افروز' کے نام سے کیا تھا۔
- 1815 میں ٹامس روبک نے خرد افروز کو مرتب کر کے اس پر مقدمہ لکھا تھا۔



خلیل علی خان اشک

- نام خلیل علی خاں تھا اور اشک تخلص۔
- خلیل علی خاں اشک کاظم علی جواں کے توسط سے گل کرسٹ تک پہنچے تھے۔
- اشک شعبۂ فارسی کے پروفیسر ہربرٹ ہارنگٹن کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے تھے۔
- اشک 9 اگست 1803 کو تیس روپے ماہوار پر منشی مقرر کیے گئے تھے۔

خلیل علی خاں اشک کی کتابیں

- خلیل علی خاں اشک نے فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کے زمانے میں کل چھ کتابیں ترجمہ و تصنیف کی تھیں جن میں سے صرف ایک یعنی داستانِ امیر حمزہ' کالج سے شائع ہوئی تھی۔

(1) داستان امیر حمزہ: خلیل علی خان اشک کی یہ پہلی تالیف ہے جو انھوں نے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے فوراً بعد گل کرسٹ کی فرمائش پر 1801 میں مکمل کی تھی۔

- ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق داستان امیر حمزہ کا ماخذ فارسی زبان کی تالیف ہے جو 'رموزِ حمزہ' کے نام سے جانی جاتی ہے۔
- لیکن اس کے برخلاف اشک نے اپنا ماخذ ملا جلال بلخی کی تصنیف کو بتایا ہے۔

(تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 540 جلد سوم)

- اردو میں سب سے پہلے خلیل علی خاں نے 'داستان امیر حمزہ' لکھی تھی اور بعد میں اسی کوکھ سے نول کشور پریس کی 46 ضخیم جلدیں جنم لی تھیں۔
- اشک کی داستان امیر حمزہ پہلی بار 1803 میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی تھی۔
- اشک کی 'داستانِ امیر حمزہ' میں سب مفرد و مرکب داستانوں کو ملا کر 88 داستانیں ہیں اور یہ سارے قصوں اور ضخیم داستانوں کی بنیادیں ہیں۔ یہاں دو کردار زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک امیر حمزہ کا اور دوسرا عمرو عیار کا۔ امیر حمزہ خیر و نیکی کی تمثیل ہیں اور عمرو عیار اپنی عیاریوں اور تمسخر سے سارے قصے میں جان ڈال دیتے ہیں۔

(تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی صفحہ 541 جلد سوم)

- گل کرسٹ نے اشک سے کہا تھا ''اس قصے کو زبان میں اردو معلیٰ کی لکھ کہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے ہے۔''

(2) رسالہ کائنات جو (3) نگارخانہ چین

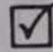
(4) انتخاب سلطانیہ (5) کتاب واقعاتِ اکبر

(6) منتخب الفوائد



مولوی اکرام علی

- مولوی اکرام علی عربی کے جید عالم تھے۔
- مولوی اکرام علی کالج کونسل کے اسسٹنٹ سکریٹری ابراہیم لاکٹ کے توسط سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے تھے۔
- مولوی اکرام علی نے فورٹ ولیم کالج کے لیے صرف ایک کتاب تیار کی تھی۔
- مولوی اکرم علی نے ولیم ٹیلر کی فرمائش پر عربی رسالہ 'اخوان الصفا' کا ترجمہ کیا تھا۔



بینی نرائن جہاں

- نام بینی نرائن تھا جہاں ان کا تخلص نہیں بلکہ شاہ جہاں آباد کی نسبت سے انھوں نے اپنے نام کے توسط سے جہاں کا لفظ شامل کرلیا تھا۔
- بینی نرائن جہاں باقاعدہ کالج کے ملازم نہیں تھے۔

بینی نرائن جہاں کی کتابیں

(1) چارگلشن: بینی نرائن کی پہلی تصنیف ہے جسے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے مطلوبہ اسلوب بیان میں 1811ء میں لکھ کر پروفیسر ٹیلر صدر شعبۂ ہندوستانی کو پیش کی تھی۔

- چارگلشن پر جہاں کو فورٹ ولیم کالج کی طرف سے انعام ملا تھا۔

(2) بہارعشق: بینی نرائن جہاں کی دوسری تصنیف ہے جس میں دلآرام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

- بہارعشق بینی نرائن نے کالج کے لیے نہیں بلکہ 'شہر' کے لیے تصنیف کی تھی۔

(3) گلزارِ حسن: بینی نرائن کی تیسری تالیف ہے۔

(4) دیوانِ جہاں (تذکرہ): بینی نرائن جہاں سے کپتان ٹامس روبک کی فرمائش پر 1812ء میں شعرائے اردو کا تذکرہ دیوان جہاں کے نام سے مرتب کیا تھا۔

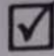
- دیوان جہاں پر بینی نرائن کو کالج کی طرف سے انعام ملا تھا۔

(5) تفریح طبع 1817ء

(6) نوبہار 1824ء

(7) باغ عشق

(8) تنبیہ الغافلین



میرزا علی لطفؔ

- نام مرزا علی تھا اور لطفؔ تخلص
- مرزا علی لطف کے والد کا نام کاظم بیگ خان استر آبادی تھا جو فارسی کے شاعر تھے اور ہجریؔ تخلص کرتے تھے۔
- مرزا لطف فورٹ ولیم کالج سے بطور مترجم وابستہ ہوئے تھے۔
- میر شیر علی افسوس سے مرزا علی لطف کے گہرے مراسم تھے۔
- مرزا علی لطف حیدر آباد جا کر آصف جاہ ثانی کے وزیر ارسطو جاہ کے یہاں ڈیڑھ سو روپے ماہوار مشاہرے پر ملازم ہوئے تھے۔

مرزا علی لطف کی تالیفات

(1) مرزا علی لطف نے گل کرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرہ 'گلزار ابراہیم' کا اردو میں ترجمہ تذکرہ 'گلشن ہند' کے نام سے 1215ھ مطابق 1801ء میں کیا تھا۔

- گل کرسٹ ہی کی تجویز پر 'گلشن ہند' اس کا نام رکھا تھا۔
- مرزا علی لطف نے تذکرہ 'گلشن ہند' میں اپنا ذکر بطور شاعر شامل کیا ہے۔

(2) مثنوی نیرنگ عشق



فورٹ ولیم کالج سے وابستہ دیگر مصنّفین کی کتابیں

للولال کوی کی تالیفات

(1) پریم ساگر (2) راج نیتی

(3) سبھا بلاس (4) مہادیو بلاس

(5) لطائف ہندی (6) سنگھاسن بتیسی

مرزا جان طپش کی تالیفات

(1) کلیات گلشن (2) شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان

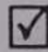
(3) بہار دانش (4) یوسف زلیخا

مولوی امانت اللہ کی تالیفات

(1) ہدایت الاسلام (عربی) (2) ہدایت الاسلام (اردو)

(3) ترجمۂ قرآن مجید (4) جامع الاخلاق

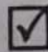
(5) صرف اردو



مرزا محمد فطرت

- مرزا محمد فطرت نے جارج ٹائنڈے کی لکھی ہوئی قواعد پر نظر ثانی کی تھی۔
- مرزا محمد فطرت نے ولیم ہنٹر کی مدد سے انجیل کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

سید حمید الدین بہاری: خوان الوان



(4) دہلی کالج

آغاز و خاتمہ

- جولائی 1823ء میں قائم ہونے والی مجلسِ تعلیماتِ عامہ کی طرف سے ٹیلر نے انگلستان کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس کے نتیجے میں انگلستان کی منظوری کے بعد مدرسہ غازی الدین خان کی تاریخی عمارت میں دلی کالج 1825ء میں قائم کیا گیا تھا۔
- دہلی کالج کو اپریل 1877ء میں توڑ کر لاہور کالج میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اپریل 1877ء میں دلی کالج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔
- دلی کالج کو 1792ء میں قائم ہونے والے مدرسہ غازی الدین خاں کی توسیع بھی کہا جاتا ہے۔

مقصد

- دہلی کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزی اور مغربی علوم سے واقف کرانا تھا۔

کالج کے اساتذہ

- 1825ء میں دلی کالج کے قیام کے بعد مجلس مقامی کے (جو کالج کی انتظامی کمیٹی تھی) سکریٹری اور کالج کے سکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ مسٹر جوزف ہنری ٹیلر کالج کے پرنسپل 175 روپے ماہانہ پر مقرر ہوئے تھے۔
- 1837ء میں مجلس مقامی نے مسٹر ٹیلر کو کالج کے پرنسپل مقرر کرنے اور ان کی تنخواہ آٹھ سو روپے ماہانہ کرنے کی تجویز پیش کی تھی جسے گورنمنٹ نے ملتوی کر دیا تھا۔

(مرحوم دلی کالج از مولوی عبدالحق صفحہ 146)

- 1839ء میں گورنمنٹ کی طرف سے جنرل کمیٹی کی پیش کردہ تجویز کی منظوری کے بعد 1841ء میں مسٹر فیاکس بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر 600 روپیہ ماہانہ پر ہوا تھا۔
- 1845ء میں مسٹر بتروس کے انگلستان چلے جانے کے بعد ان کی جگہ پر یعنی کالج کی پرنسپلی پر اسی سال الوائس اسپنرنگر کا تقرر ہوا تھا۔
- سرسید نے 'آثار الصنادید' اور ماسٹر رام چندر نے 'فوائد الناظرین' اسپرنگر کی ایما پر شائع کیا تھا۔

- گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے لکھنؤ میں ڈاکٹر اسپرنگر نے شاہان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کی تھی۔
- تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام اور نصاب تعلیم کو یکساں ڈاکٹر اسپرنگر نے کیا تھا۔
- 1850ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کے بنگال منتقل ہو جانے کے بعد کالج کے پرنسپلی کی خدمت پر مسٹر جے کارگل کا تقرر رہوا تھا۔
- مسٹر کارگل کے چلے جانے کے بعد مسٹر ٹیلر قائم مقام پرنسپل 1854ء میں ہوئے تھے۔
- 1857ء کے بغاوت کے وقت دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر ہی تھے۔
- 1857 کے باغیوں نے مسٹر ٹیلر کا قتل کر دیا تھا۔
- دوبارہ کالج کھلنے کے بعد 1864ء میں مسٹر ایڈمنڈ ولمٹ پھران کے بعد پروفیسر ایلس دلی کالج کے پرنسپل کی خدمت پر فائز ہوئے تھے۔

مشرقی شعبے کے اساتذہ

- مولوی مملوک علی تحریر اقلیدس (ترجمہ)، سنن ترمذی (ترجمہ)
- مولوی امام بخش صہبائی: حدائق البلاغت (ترجمہ)
- مولوی سبحان بخش: محاورات ہند، وفیاتِ اعیان ترجمۂ تاریخ ابن خلکان، تزک تیموری (ترجمہ)، تذکرۂ مفسرین اور ایک تذکرۂ حکما
- ماسٹر وزیر علی
- ماسٹر امیر علی
- ماسٹر رام چندر
- ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ جو بعد میں سائنس کے ماسٹر ہو گئے تھے۔
- ماسٹر رام چندر ریاضی کے بڑے استاد تھے۔
- ماسٹر رام چندر نے دلی کالج میں شروع سے آخر تک تعلیم حاصل کی تھی۔
- ماسٹر رام چندر نے اردو میں الجبرا اور علم مثلث پر کتابیں لکھی تھیں۔
- ماسٹر رام چندر نے رسالہ 'فوائد الناظرین' رسالہ 'محب ہند' جاری کیے تھے۔
- ماسٹر رام چندر نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔

- ماسٹر رام چندر نیو ہیڈ ماسٹر ٹامسن سول انجینئرنگ کالج 1858ء میں مقرر ہوئے تھے۔
- ماسٹر رام چندر 1885 میں دلی ڈسٹرکٹ اسکول کے صدر مدرس ہوئے تھے۔
- ماسٹر رام چندر کی کتابیں: جبر و مقابلہ، کلیات و جزئیات
- ضیاءالدین
- پیارے لال: یہ دہلی کالج کے طالب علم اور ماسٹر رام چندر اور مولانا امام بخش کے شاگرد تھے۔ فراغت کے بعد دلی کالج میں استاد ہوئے تھے۔
- کتابیں

قصص ہند حصۂ اوّل، قصص ہند حصۂ سوم، رسوم ہند کا ابتدائی نصف حصہ، تاریخ انگلستان (کلاں)، دربار قیصری 1877ء تالیف مسٹر ویلر کا ترجمہ، رسالہ اتالیق کے اکثر مضامین۔

* بھیروں پرشاد * اشرف علی
* مولوی ذکاءاللہ * مولوی احمد علی
* پنڈت رام کشن دہلوی: مزید الاموال بالاصلاح الاحوال
* ماسٹر حسینی: تاریخ مغلیہ (ترجمہ)، تاریخ ایران (ترجمہ)، قانون محمدی، فوجداری (ترجمہ)، قانون وراثت اسلامی، قانون دیوانی، قانون فوج داری
* ہردیو سنگھ منشی گری * ماسٹر نور محمد تحتانی * مولوی حسن علی

دلی کالج کے طلبہ

- ماسٹر رام چندر، شمس العلما نذیر احمد، شمس العلما محمد حسین آزاد، شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ، شمس العلما ضیاءالدین دلی کالج کے طالب علموں میں سب سے اہم نام ہیں:

* مسٹر پتمبر * موتی لال دہلوی * پنڈت من پھول
* ماسٹر کیدار ناتھ * پیرزادہ محمد حسین * خواجہ محمد شفیع
* میر ناصر علی * مدن گوپال * پنڈت دھرم نرائن
* شیو نرائن

- مولوی کریم الدین: تعلیم النسا، گلستان ہند، تذکرہ شعرائے ہند، گلدستۂ نازنیناں، تذکرۃ النساء، ترجمۂ ابوالفدا، تاریخ شعرائے عرب۔
- پنڈت کاشی ناتھ، آتما رام، چھمن داس

دہلی کالج کے متعلق کچھ اہم معلومات

- کالج کے ابتدائی زمانے میں زیادہ تر فارسی اور عربی کی تعلیم ہوتی تھی۔
- دہلی کالج میں شروع ہی سے سنسکرت، حساب اور مبادیات اقلیدس بھی پڑھائے جاتے تھے۔
- دلی کالج میں سر چارلس منکاف کی سفارش پر انگریزی جماعت کا اضافہ 1828ء میں ہوا تھا۔
- اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر 'وزیر بادشاہ اودھ' نے دلی کالج کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ وقف کر دیے تھے۔
- دلی کالج کے نصاب میں جیومیٹری (علم ہندسہ) کا اضافہ 1832ء میں کیا گیا تھا۔
- دلی کالج 1857ء کی بغاوت کے بعد بند ہو گیا تھا۔
- دلی کالج دوبارہ مئی 1864ء میں از سر نو قائم ہوا تھا۔

دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی

- مسٹر فیلکس بتروس نے دلی کالج کے ماتحت 'انجمن اشاعت علوم بذریعۂ السنۂ ملکی' یا 'دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی 1843ء میں قائم کی تھی۔ (مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق صفحہ 133) (کہیں کہیں 1941 بھی درج ہے)
- دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کا مقصد علوم مفیدہ کا دیسی زبانوں (اردو، بنگالی اور ہندی) میں ترجمہ کرنا یا دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار کرنا تھا۔
- 'دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی' یا 'انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنۂ ملکی کے سکریٹری مسٹر ایف بتروس تھے۔
- بتروس کے بعد دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے سکریٹری اسپرنگر بھی رہے تھے۔



(5) دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد

آغاز، مقصد اور خاتمہ

- انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم ایجوکیشنل کانفرنس کی درخواست پر میر عثمان علی خان آصف سابع نے ریاست حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کے لیے اگست 1917ء میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کا فرمان جاری کیا تھا جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہو (جسے لوگ آج عثمانیہ یونیورسٹی کے نام سے جانتے ہیں)

(دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات از مجید بیدار، صفحہ 20)

- دارالترجمہ اسی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کی اردو میں اشاعت کے لیے ستمبر 1917ء میں حیدرآباد میں قائم کیا گیا تھا۔
- دارالترجمہ سے سائنس، انجینئر نگ، میڈیسن، قانون اور علوم عمرانیات کی کتابیں انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔
- دارالترجمہ میں ترجمہ کی ہوئی سب سے پہلی کتاب 1919 میں شائع ہوئی تھی۔
- دارالترجمہ میں مترجمین 1917 سے 1950ء تک کارگزار رہے تھے۔
- دارالترجمہ کی آخری کتاب 1950ء میں ترجمہ کی گئی تھی جو 1981ء میں شائع ہوئی تھی اسی لیے دارالترجمہ کی ساری کارکردگی کو 33 سالہ خدمات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
- دارالترجمہ کی عمارت میں آگ 18 اگست 1955ء میں لگی تھی جس کی وجہ سے اس کی اکثر کتابیں جل گئی تھیں۔

(دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات از مجید بیدار صفحہ 163)

دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے متعلق چند دیگر معلومات

- جامعہ عثمانیہ کا قیام دارالترجمہ کے قیام کے بعد اکتوبر 1918ء میں عمل میں آیا تھا۔
- اردو کو تعلیمی سطح پر رائج کرنے کا تجربہ سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا تھا۔
- جامعہ عثمانیہ اپنے وقت کی واحد اور پہلی یونیورسٹی تھی جس میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم اے کی سطح تک اور میڈیکل، انجینئر نگ، قانون اور سائنسی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔
- دارالترجمہ سے وابستہ آخری ادیب پروفیسر محمد مجیب ہیں۔

- پروفیسر محمد مجیب کی کتاب تاریخ تمدن ہند کو دارالترجمہ کی آخری اشاعت کا شرف حاصل ہے۔

دارالترجمہ کے نظما: مترجمین اور دیگر نمائندے

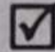
- دارالترجمہ میں تین قسم کے مترجمین تھے (1) ہمہ وقتی مترجمین (2) جز وقتی مترجمین (3) وقتی مترجمین
- دارالترجمہ کی 33 سالہ کارکردگی میں جن 7 لوگوں کا بطور ناظم تقرر ہوا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں: (1) مولوی عبدالحق (2) مولوی سید محی الدین (3) مولوی حمید احمد انصاری (4) مولوی محمد عنایت اللہ (5) مولوی محمد الیاس برنی (6) ڈاکٹر نظام الدین (7) ایشور ناتھ ٹوپا۔
- دارالترجمہ سے وابستہ 129 مترجمین میں سے چند اہم کے نام حسب ذیل ہیں:

* عبداللہ عمادی	* سید ہاشمی فرید آبادی	* عبدالماجد دریابادی
* عبدالباری ندوی	* خلیفہ عبدالحکیم	* محمد عبدالرحمٰن
* عبدالحلیم شرر	* مرزا محمد ہادی رسوا	* جوش ملیح آبادی
* قاضی تلمذ حسین	* سید علی رضا	* یوسف حسین خان
* ظفر علی خان	* پروفیسر محمد مجیب	

- دارالترجمہ میں دو عہدے ناظر مذہبی اور ناظر ادبی کے نام سے تھے۔
- ان ناظرین کا کام دارالترجمہ میں ترجمہ شدہ کتابوں کی مذہبی و ادبی نقطۂ نظر سے جانچ پڑتال کرنا تھا۔
- دارالترجمہ میں ناظر مذہبی کی حیثیت سے پہلے مولوی حاجی صفی الدین اور بعد میں مولوی عبداللہ عمادی کا تقرر ہوا تھا۔
- دارالترجمہ میں ناظر ادبی کے عہدے پر یکے بعد دیگرے نواب حیدر یار جنگ، نظم طباطبائی اور جوش ملیح آبادی فائز ہوئے تھے۔
- دارالترجمہ میں زبان کے نمائندے مولوی وحید الدین سلیم، نواب حیدر یار جنگ، علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا تھے۔
- دارالترجمہ میں مذہبی امور کی نمائندگی کے لیے عبداللہ عمادی، طبیعیات کی نمائندگی کے لیے محمد نصیر الدین عثمانی اور کیمیا کی نمائندگی کے لیے چودھری برکت علی اور محمود احمد خاں تھے۔

دارالترجمہ میں وضعِ اصطلاحات

- کسی علم سے متعلق ایک زبان میں کوئی لفظ موجود ہو، دوسری زبان میں اسی لفظ کے لیے نیا لفظ وضع کرنے کو اصطلاح وضع کرنا کہتے ہیں۔
- اردو میں اصطلاحات وضع کرنے کے لیے سب سے پہلے 'مجلس وضع اصطلاحات' دارالترجمہ حیدرآباد کے تحت قائم کی گئی تھی۔
- دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کی پہلی مجلس 1918ء میں ہوئی تھی اور آخری مجلس 1946ء کو منعقد ہوئی تھی۔
- دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کی ابتدائی مجلسوں میں وحیدالدین سلیم، عبدالحق، مرزا رسوا، نظم طباطبائی، مہدی خان کوکب اور حمیدالدین وغیرہ شامل ہوئے تھے۔
- دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کی آخری مجلس میں ڈاکٹر نظام الدین ناظم دارالترجمہ، مولوی عبداللہ عماری ناظر مذہبی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حاجی غلام محمد، عاقل علی خان، محمد نصیر احمد عثمانی اور اشفاق حسین وغیرہ شامل تھے۔
- دارالترجمہ کی مجلس وضع اصطلاحات کے ذریعہ انجینئرنگ، میڈیسن، قانون، سائنس اور علوم عمرانیات کی تقریباً 91,000 اصطلاحات اردو میں تیار کی گئی تھیں۔
- دارالترجمہ کی 12 متفرق مجلسوں نے 32 علوم وفنون کی نئی اصطلاحات مرتب کی تھیں۔



(6) اردو میں اصلاح زبان کی روایت

- ایہام گوئی کی تحریک کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی تھی اسے اصلاحِ زبان کی تحریک کہتے ہیں۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک میں اولیت مرزا مظہرِ جانِ جاناں کو حاصل ہے۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے فارسی اور اردو زبان کو ایک ہی تار سے بننے کی کوشش کی تھی۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے اصلاح زبان کو مذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھ کرانجام دیا تھا۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنے شاگردوں کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا تھا۔
- شاہ حاتم نے اصلاح زبان سے متعلق قواعد وضوابط مرتب کیے تھے۔
- ملک بھر میں ایک مرکزی ریختہ رائج کرنے اور زبان کو غیر مانوس الفاظ سے پاک وصاف کرنے کی سعی شاہ حاتم نے کی تھی۔
- ریختہ میں فارسی فعل وحروف مثلاً در، بر، از، او وغیرہ کے استعمال کو ناجائز شاہ حاتم نے قرار دیا تھا۔
- عربی وفارسی الفاظ کو صحت املا کے ساتھ لکھنے کی تاکید شاہ حاتم نے کی تھی۔
- ہندی بھاشا مثلاً نین، جگت، نت، موا، بجن، من اور موہن وغیرہ کا استعمال شاعری میں شاہ حاتم نے عیب قرار دیا تھا۔
- متروک الفاظ اوران کے متبادل مانوس الفاظ کی فہرست شاہ حاتم نے مرتب کی تھی۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک کو تصوف کے آئینے میں درد نے دیکھا تھا۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک میں اردو زبان کا نیا وجود سودا کا مرہون منت ہے۔

(اردو ادب کی تحریکیں: انور سدید، صفحہ 206)

- میر نے ریختہ میں فارسی حروف اور افعال، غیر مانوس تراکیب اور نامناسب بندشوں کے استعمال کو قبیح قرار دیا ہے۔
- میر نے فارسی کی ایسی تراکیب جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں کہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔
- میر نے سیر، جراحت، جان، سطح اور خلش وغیرہ کو مذکر اور خواب، گلزار، حشر، مزار وغیرہ کو مونث باندھا ہے۔
- روزمرہ کے مجلسی لہجے کو زبان کے ادبی لہجے سے ہم آہنگ میر حسن نے کیا تھا۔
- اصلاح زبان کے حوالے سے سب سے بڑا کام ناسخ نے کیا ہے۔

ناسخ

- ناسخ کا نام شیخ امام بخش تھا اور ناسخ تخلص۔
- ناسخ 1772ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔
- ناسخ کا انتقال 1838ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا۔
- ناسخ کے والد کا نام شیخ خدا بخش تھا جو تاجر پیشہ اور لاہور کے رہنے والے تھے۔
- ناسخ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ ناسخ نے خود اپنی کوشش سے فن شاعری اور متعلقہ علوم پر ایسی قدرت حاصل کی تھی کہ استاد وقت بن گئے تھے۔
- ناسخ کا رنگ کالا اور جسم بھدا تھا۔ ناسخ ورزش کے بے حد شوقین تھے۔
- ناسخ دن رات میں صرف ایک بار کھاتے تھے مگر اس کا وزن پانچ سیر کے قریب ہوتا تھا۔
- ناسخ کی غزل پر اصلاح دینے سے میر نے انکار کر دیا تھا۔
- غازی الدین حیدر نے ناسخ کو اپنے دربار سے متعلق کر کے ملک الشعرا کے خطاب کی پیش کش کی تھی جسے ناسخ نے قبول نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ اتنے چھوٹے سے بادشاہ کا خطاب مجھے قبول نہیں۔
- ناسخ کو تنقید نگاروں نے ادبی ڈکٹیٹر کہا ہے کیونکہ انھوں نے جو اصلاحیں تجویز کیں ان پر خود بھی سختی سے عمل کیا ہے اور شاگردوں سے بھی اس پر عمل کرایا ہے۔
- ناسخ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں سے ہیں۔

اصلاحِ زبان کے حوالے سے ناسخ کا کارنامہ

- سب سے پہلے ناسخ نے زبان کا نام اردو مستند قرار دیا اس کے علاوہ اردو کے جتنے نام رہ چکے تھے اور جو چلے آرہے تھے مثلاً ہندوی، ہندوستانی، زبانِ ہندوستان دہلوی یا لاہوری، ریختہ یا اردوے معلیٰ اور دکنی ان سب کی جگہ ناسخ نے یہ اصول طے کر دیا کہ آئندہ محض ایک نام 'اردو' ہوگا ہر دوسرا نام متروک سمجھا جائے گا۔
- **حروف میں اصلاح:** ناسخ نے حروفِ ربط کو اردو غزل کی زمینوں میں استعمال کیا اور ردیف کی بنیاد حروفِ ربط یعنی کا، کی، کے، کو، سے، نے، پر اور تک وغیرہ پر رکھی۔
- **حروفِ اثبات ونفی کا استعمال:** ہے اور نہیں کو بھی شاعری میں استعمال کیا جانے لگا۔ نئی زمینوں کے

بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہو اور نہیں کا استعمال بھی۔

سب زمینیں ہیں نئی بیتیں نہیں اے یار نئی
روز یہاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی

- **مصادر میں تبدیلی:** جو مصادر تھے ناسخ نے صرف انھیں کے استعمال کی اجازت روا رکھی ہے وہ مصادر جو اصولاً غلط تھے جنھیں بعض شعرا نے اپنی آسانی کے سبب گھڑ لیا تھا، انھیں متروک قرار دیا گیا۔ مثال کے طور پر مجبورؔ کا شعر ہے۔

باتیں دیکھ زمانے کی جی باتوں میں بہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

- **افعال میں ترمیم:** بہت سے مروجہ افعال جواز روئے اصول غلط تھے ان کا بدل ناسخؔ نے قائم کیا مثلاً:

مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل
بدلہ کرنا	بدلہ لینا	جھکے ہے	جھکتا ہے	لگے ہے	لگتا ہے
لاگا	لگا	کوہ چیرا	کوہ پھاڑا	کہے ہیں	کہتے ہیں
آئے ہے	آتا ہے	جائے ہے	جاتا ہے	سمجھا جائے ہے	سمجھا تا ہے

مثلاً شعر ہے۔

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل
کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

یا مومن کا مصرعہ ہے۔

کس کے استقبال کو جی میرا تن سے جائے ہے

- **ہندی اور بھاشا کے الفاظ کا ترک:** ناسخ نے ہندی اور بھاشا کے الفاظ کو ترک کر کے ان کی جگہ فارسی الفاظ اور عربی الفاظ و اصطلاحات کو زیادہ استعمال کیا مثلاً نک اور تنک کی جگہ ذرا بن کی جگہ بغیر دوانہ کے بجائے دیوانہ یوں کے بجائے سوا ماٹی ک جگہ مٹی کو معیاری قرار دیا ہے۔
- **ضمائر میں تبدل:** فارسی عربی اور ہندی زبان کے جو ضمائر اردو میں مستعمل تھے ان میں بعض کو بالکل ترک کرنے کا حکم دیا گیا اور بعض میں تبدیلی کر کے ان کا استعمال روا رکھا گیا مثلاً اس نے سے ان نے ترے یا تجھ کو سے تجھ جس نے سے جن نے تو سے تئیں۔
- **تذکیر و تانیث:** ناسخ کے زمانے تک تذکیر و تانیث کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے بھی قاعدے مقرر کیے مثلاً زخمیں (مؤنث)، زخم (مذکر)، ؛ چیز جدی ہے کہنے کے

بجائے 'وہ چیز جدا ہے' وغیرہ کہنے پر زور دیا ہے۔

- **واحد کے صیغے:** جمع بنانے کا دکنی قاعدہ ان کے بجائے 'میں' بنایا گیا۔ پہلے عورت کی جمع عورتاں بات کی جمع باتاں مستعمل تھا۔ ناسخ نے عورتیں اور باتیں کو مستند قرار دیا۔
- **محاورات کی اصلاح:** مروجہ محاوروں میں بھی اصلاح کی گئی۔ قدرے تبدیلی کر کے ان کی صحیح شکل اختیار کی گئی۔ مثلاً:

مروجہ	اصلاح شدہ	مروجہ	اصلاح شدہ
رو رکھنا	مونھ رکھنا	خیال لینا	خیال باندھنا
انتہا لانا	انتہا کو پہنچنا	زنجیر رہنا	قیدی رہنا
پلک مارنا	پلک جھپکنا	دامن چلنا	دامن مسکنا

- ناسخ نے معشوق اور محبوب کے لیے ہندی لفظ سجن کی جگہ فارسی صنم کو درست قرار دیا ہے۔
- قدما بول چال کی زبان کو کلام میں باندھتے تھے اس کے لیے ناسخ نے ایسے الفاظ زبان سے بالکل چھانٹ دیئے۔
- ناسخ نے جذبہ واحساس کو خارج کر کے معنی بندی اور مضمون آفرینی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور ساتھ ہی ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جو شاعری کے لیے کھردرے اور بے ڈول سمجھے جاتے تھے۔
- ناسخ نے ہندی الاصل الفاظ کو طرزِ جدید سے خارج کر کے اس کی جگہ فارسی وعربی کے الفاظ استعمال کیے تھے۔
- ناسخ نے حشو وزوائد کے استعمال پر کڑی پابندی لگائی تھی، غرابت اور تعقید سے بچنے کی تلقین کی تھی اور بندش کے طرز فارسی کو فروغ دیا تھا۔
- فحش الفاظ کو غزل میں ناسخ نے ممنوع قرار دیا تھا۔
- ریختہ کو اردو زبان کا نام ناسخ نے دیا تھا۔ (شعرالہند از عبدالسلام ندوی ص 159)
- محاورۂ دہلی کے مقابلے میں محاورۂ لکھنؤ ناسخ نے وضع کیا تھا۔
- صنف غزل کے لیے ریختہ کو متروک ناسخ نے قرار دیا تھا۔ معلوم ہو کہ پہلے غزل کو بھی ریختہ کہا جاتا تھا۔
- غزل کو عاشقانہ جذبات کے علاوہ دیگر مضامین کی ادائیگی کے قابل ناسخ نے بنایا تھا۔
- ناسخ نے اپنی غزلوں میں 'مثالیہ' کو کثرت سے برتا ہے۔ مثالیہ میں شاعر ایک مصرع میں ایک بات کہتا ہے جسے آپ دعویٰ کہہ سکتے ہیں اور پھر اس بات (دعوی) کو قابل قبول، پراثر اور مدلل

بنانے کے لیے ایک دلیل لاتا ہے۔

ناسخ کے شاگرد

* ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ناسخ کے شاگردوں کی تعداد کم سے کم 103 بتائی ہے۔
* علی اوسط رشکؔ کا نام شاگردانِ ناسخ میں اہمیت کا حامل ہے۔
* آغا حسن امانت * سید محمد مرزا انس * امداد علی بحر
* فتح الدولہ * محمد رضا برق
* محمد عظیم اللہ رغمی ابن امین اللہ طوفان * غلام امام شہید
* فقیر محمد خان گویا * منیر شکرہ آبادی * حاتم علی بیگ مہر
* خواجہ محمد وزیر * کلب حسین نادر

ناسخ کے کارنامے

* ناسخ کے کل چار دیوان ہیں: تین اردو میں اور ایک فارسی میں۔
* دیوان اول کا تاریخی نام 'دیوان ناسخ' ہے جسے ناسخ کے شاگرد میاں غنی نے تجویز کیا تھا۔
* دیوانِ دوم کا تاریخی نام 'دفتر پریشان' ہے۔
* دیوان سوم کا تاریخی نام دود دفتر شعر ہے اسے ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے تجویز کیا تھا۔

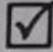
ناسخ کے متعلق مختلف آرا و خیالات

* اس (ناسخ) نے اصلاحِ زبان کے لیے متشدد رویہ اختیار کیا تھا اور قدیم پیغمبرانِ سخن کی شریعتیں منسوخ کر دیں (عبدالسلام ندوی شعرالہند)
* ولی نے جس اجتہاد کی ابتدا کی تھی اس کا نقطۂ انجام ناسخ ہے۔ (انور سدید)
* غالب نے ناسخ کے رنگ سخن کو 'طرزِ جدید' کا نام دیا ہے اور ناسخ کو طرزِ جدید' کا موجد ٹھہرایا ہے۔
* کلب حسین خان نادر نے ناسخ کو 'واضع طرز جدید' قرار دیا ہے۔
* مرزا محمد رضا برق نے ناسخ کے متعلق لکھا ہے کہ 'سادہ گوئی' کے ناسخ اور طرزِ نو (تازہ گوئی) کے ایجاد کرنے والے ہیں۔
* وہ (ناسخ) پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ ہیں (غالب)

c ناسخ نے زبان کو ایسا درست کیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم معلوم نہیں ہوتی (امداد امام اثر)

دیگر تصانیف

(1) مولد شریف رسول مختار (مثنوی)
(2) معراج نامہ مثنوی
(3) شہادت نامہ آل نبی (مثنوی)
(4) مثنوی ناسخ جس کا اصل نام ’مثنوی در بیان ولادت وفضائل حضرت علی علیہ الصلوٰۃ والسلام‘ ہے۔
(5) سراج نظم (مثنوی)



(7) اردو میں ایہام گوئی

- ایہام عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے 'وہم میں ڈالنا'
- ایہام گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں ایسا ذو معنی لفظ استعمال کرے جس سے سننے والا تھوڑی دیر کے لیے وہم میں پڑ جائے کہ آخر اس کے صحیح معنی کیا ہیں؟ عام طور سے ایسے لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں ایک معنی قریب جو آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے لیکن وہ شاعر کی مراد نہیں ہوتا اور دوسرا معنی بعید جو تھوڑے تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے اور یہی معنی بعید شاعر کی مراد ہوتا ہے۔
- اردو میں ایہام گوئی کا رواج سب سے زیادہ محمد شاہی عہد میں ہوا تھا۔ اردو میں ایہام ہندی شاعری کے اثر سے آیا ہے۔
- خواجہ میر درد نے ایہام کو لفظ دوئی قرار دیا ہے۔
- محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی دوہوں کی اساس پر فروغ حاصل ہوا۔
- ایسا ہی مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اردو ایہام پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوا اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ہے۔
- ایہام کی تحریک کا نقطۂ آغاز ولی کو قرار دیا جاتا ہے۔ (اردو ادب کی تحریکیں، ص190)
- ایہام گوئی کے نامور شعرا میں آرزو، آبرو، شاکر ناجی، یک رنگ اور مضمون کا شمار ہوتا ہے۔
- احسن، شاہ ولی اللہ اشتیاق، عبدالوہاب یکرو اور میر محمد سجاد بھی ایہام گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔
- شاہ حاتم کا بھی رجحان ابتداءً ایہام گوئی کی طرف تھا۔
- تحریکِ ایہام کے خلاف ردعمل کا اظہار مرزا مظہر جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقینؔ، ظہور الدین حاتمؔ اور مرزا محمد رفیع سودا نے کیا تھا۔
- سب سے پہلے ایہام گوئی کے خلاف مرزا مظہر جانِ جاناں نے آواز بلند کی تھی۔
- انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے دربار میں ایہام کا بہت زور تھا۔
- شیکسپیئر کے ڈراموں میں ایہام (Pun) کثرت سے استعمال ہوا ہے۔
- مغرب میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی طرح ڈاکٹر جانسن نے ایہام گوئی کے خلاف مہم چلائی تھی اور اسے مبتذل کہہ کر رد کر دیا تھا۔
- فرانس میں لوئی چہار دہم کے عہد میں ایہام کا رواج ہوا تھا۔
- ولی کے تلامذہ میں سے شیخ نثار، عمر، رضی اور اشرف اور ان کے معنوی تلامذہ میں سے سراج، داؤد اور عزلت وغیرہ نے دکن میں ایہام کو اپنا شعار بنایا تھا۔ (اردو ادب کی تحریکیں از انور سدید، صفحہ 190)

ایہام سے متعلق شعرا

خان آرزو

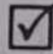
- نام شیخ سراج الدین علی، خطاب استعداد خاں اور تخلص آرزو تھا۔
- خان آرزو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔
- خان آرزو نے اردو میں تقریباً 27 اشعار کہے ہیں۔
- خان آرزو صنعت ایہام کے استاد مانے جاتے تھے۔
- میر نے آرزو کو 'استاد و پیر و مرشد بندہ' کہا ہے۔
- میر نے لکھا ہے کہ 'اس فنِ بے اعتبار کو جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے (آرزو نے) معتبر بنایا،...... تمام ثقہ استادان فنِ ریختہ بھی انہی بزرگوار کے شاگرد ہیں۔

خان آرزو کے شاگرد

* سودا * میر * درد * شاہ مبارک آبرو
* مضمون * مصطفیٰ خان * یک رنگ * آنند رام مخلص
* ٹیک چند بہار
* خان آرزو کی ایہام گوئی کی ایک مثال

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں زندگانی کا کیا بھروسا ہے

اس شعر میں 'جان' سے صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے۔



آبرو

- آبرو کا نام نجم الدین، عرفیت شاہ مبارک اور تخلص آبرو تھا۔
- آبرو خان آرزو کے شاگرد اور رشتہ دار تھے۔
- آبرو گوالیار میں پیدا ہوئے اور جوانی میں دہلی آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔
- آبرو کے ایک آنکھ میں پھولا تھا جسے طنزاً مرزا مظہر جانِ جاناں نے 'گانٹھ' کہا ہے۔

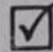
- خوشگو نے آبرو کے بارے میں کہا ہے کہ ریختۂ آبرو، آبروے شعر ریختہ یعنی آبرو اردو شاعری کے آبرو ہیں۔
- آبرو کو ایہام گویوں کا رہ نما کہا جاتا ہے۔
- آبرو کی شاعری سے ایہام کی مثالیں

ہوئے ہیں اہلِ زر خواہانِ دولت خواب غفلت میں
جسے سونا ہے یارو فرش پر مخمل کے کہہ سوجا

- زر کے معنی سونا، سونا کے معنی نیند۔ خواہانِ دولت کا خواب غفلت سے تعلق بھی واضح ہے۔ یہاں الفاظ و معانی دونوں سے ایہام پیدا کیا گیا ہے:

معشوق سانولا ہو تو کرتا ہے دل کوں پیار
کالے کی چاہ میں ظاہر ہے من کے ساتھ

- من بمعنی دل اور طبیعت، اور من وہ مہرہ جو کالے سانپ کے پیٹ میں ہوتا ہے اور جس وقت سانپ شب تاریک میں اس کو اگلتا ہے تو وہ شعلے کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ اس شعر میں من سے صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے۔

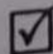


شاکر ناجی

- محمد شاکر ناجی دہلی کے رہنے والے تھے۔
- محمد شاکر ناجی پیشے کے اعتبار سے سپاہی تھے
- محمد شاکر ناجی اپنے ایہام گوئی پر فخر کرتے تھے۔
- امرد پرستی سے متعلق اشعار سب سے زیادہ ناجی کے دیوان میں ملتے ہیں۔
- میر نے ناجی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا مزاج زیادہ تر ہزل کی طرف مائل تھا۔

نمونۂ کلام

تجھ کو کیوں کر جدا کروں اے جان
زندگانی بہت ہی پیاری ہے



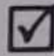
یک رنگ

- یک رنگ کا نام مصطفیٰ خان تھا اور یک رنگ تخلص
- مصطفیٰ خان یک رنگ مضمون کے معاصر تھے اور انھیں کے طرز میں شعر کہتے تھے۔

نمونۂ کلام

عبث کو بے کسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے   میرا صبر و قرار جاتا ہے



مضمون

- نام شیخ شرف الدین تھا اور مضمون تخلص۔
- مضمون اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔
- مضمون بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔
- مضمون ایہام گوئی کے بنیاد رکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔
- مضمون کو بھی ناجی کی طرح اپنی ایہام گوئی پر بڑا ناز تھا۔
- مضمون نے:

ہوا ہے جگ میں مضمون شہرہ تیرہ
طرح طرح ایہام کی جب سیں ......

- شیخ شرف الدین مضمون، خان آرزو کے شاگرد تھے۔
- مضمون کے سارے دانت نزلے کے سبب گر گئے تھے اس لیے آرزو انھیں 'شاعر بے دانہ' کہتے تھے۔
- ایہام گوئی کی مثالیں مضمون کی شاعری سے:

ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج   کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج
مضمون شکر کر کہ ترا نام سن رقیب   غصے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

مرزا مظہر جانِ جاناں

- مرزا مظہر کا نام جانِ جاناں، تخلص مظہر اور لقب شمس الدین حبیب اللہ تھا۔
- مرزا مظہر عوام میں جان جاناں کے نام سے مشہور تھے۔
- تحریک ایہام کے خلاف سب سے پہلے ردعمل کا اظہار کرنے والے مرزا مظہر جانِ جاناں تھے۔

مرزا کی تصانیف

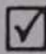
(1) دیوانِ فارسی (2) خریطۂ جواہر (3) اردو کلام

نمونۂ کلام

خدا کے واسطے اس کوں نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے
یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

مظہر جان جاناں کے شاگرد

* یقین
* جزیں
* قلی خان حسرت
* بیان
* دردمند
* قدرت اللہ قدرت
* بساون لعل بیدار



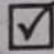
شاہ حاتم

- نام شیخ ظہور الدین حاتم تھا لیکن عرف عام میں شاہ حاتم کے نام سے موسوم تھے۔
- لفظ 'ظہور' شاہ حاتم کا تاریخی نام ہے جس سے سنہ ولادت 1111ھ مطابق 1700-1699 برآمد ہوتا ہے۔
- شاہ حاتم نے ساری عمر شادی نہیں کی اور آزادانہ زندگی گزاردی۔
- شاہ حاتم ابتدا میں رمزی تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں شاہ حاتم اختیار کر لیا تھا۔
- شاہ حاتم جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔
- شاہ حاتم دلی میں 1700-1699 میں پیدا ہوئے تھے۔

- شاہ حاتم نے اپنی طویل زندگی میں اردو شاعری کی دو تحریکوں (ایہام گوئی اور ردعمل کی تحریک) کا ساتھ دیا تھا۔
- شاہ حاتم نے ابتداً آبرو، ناجی اور مضمون کے ساتھ ایہام گوئی کی تحریک میں شامل رہ کر 1144ھ/ 32-1731 میں اپنا دیوان (قدیم) مرتب کیا تھا۔
- شاہ حاتم نے بعد میں مرزا جانِ جاناں کی تحریک کے زیر اثر ایہام گوئی سے کنارہ کشی اختیار کیا تھا اور ایہام گوئی کے خلاف ردعمل کی تحریک میں شامل ہوئے تھے۔
- شاہ حاتم نے ردعمل کی تحریک میں شامل ہو کر اپنے قدیم دیوان کو مسترد کر دیا تھا اور 'دیوان زادہ' کے نام سے نیا دیوان 1169ھ/ 56-1755ء میں مرتب کیا تھا۔
- شیخ ظہور الدین حاتم نے ولی کے دیوان سے گہرا اثر لیا ہے اور ولی کے ساتھ معنوی تلمذ کا رشتہ قائم کیا۔

نمونۂ کلام

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا
ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا



(8) اردو ادب میں رومانی تحریک

- رومانیت ایک جذبہ اور ایک طرزِ فکر سے عبارت ہے جو حد سے بڑھی ہوئی منطقیت اور عقلیت پسندی کے ردعمل میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔
- اردو ادب میں رومانوی تحریک سرسید اور علی گڑھ تحریک کی منطقیت اور عقلیت پسندی کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔
- رومانیت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہوئی تھی لیکن اسے فروغ پہلی جنگ عظیم کے بعد یعنی بیسویں صدی میں حاصل ہوا تھا۔
- یاد رہے کہ علی گڑھ تحریک بھی انیسویں صدی کی تحریک ہے تو اس طرح تحریکات کی ترتیب یوں ہے: علی گڑھ تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق
- رومانیت پسند ادیب وشاعر سماج سے زیادہ فرد پر زور دیتا ہے۔
- رومانیت کی ابتدا کا سہرا روسو کے سر باندھا جاتا ہے جس نے کائنات کو زنداں تصور کیا تھا اور آزادی کا مرجع دل کو بنایا تھا۔
- مغربی شعرا وادبا میں سے ولیم بلیک، کولرج، ورڈسورتھ، شیلے اور کیٹس وغیرہ نے رومانوی تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔
- اردو ادب میں سرسید کی عقلیت کے خلاف عہد سرسید میں سب سے پہلے رومانی ردعمل کا اظہار محمد حسین آزاد، ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر نے کیا تھا۔
- اردو ادب میں رومانیت کے اوّلین نقوش میر ناصر علی دہلوی کی تحریروں کو قرار دیا جاتا ہے۔
- میر ناصر علی دہلوی نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں ''تیرہویں صدی، فسانۂ ایام اور صلائے عام'' وغیرہ کے نام سے رومانی رسائل جاری کیے تھے۔
- مخزن جس کا اجرا 1901 میں عبدالقادر کی ادارت میں ہوا تھا اس رسالے سے بھی رومانوی تحریک کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔
- محمد حسین آزاد، ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر کا تعلق رومانیت کی صبح کاذب کے ساتھ تھا تو اقبال اور ابوالکلام نے اسے صبح صادق کا اجالا عطا کیا اور یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور نیاز فتح پوری کے عہد میں یہ تحریک نصف النہار پر پہنچ گئی۔

(اردو ادب کی تحریکیں از انور سدید، ص 431)

- ادب لطیف کے شماروں کے ذریعے بھی رومانوی تحریک کو تقویت ملی تھی جس میں مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری رومانی مضامین اور افسانے لکھا کرتے تھے۔
- رومانی تحریک کے شعرا میں اقبال، جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری، مجاز اور ساغر نظامی اہم ہیں۔
- رومانی نقادوں میں مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، نیام فتح پوری، عبدالماجد دریابادی اور فراق گورکھ پوری ہیں۔

رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا، شعرا اور ناقدین

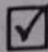
* محمد حسین آزاد	* میر ناصر علی دہلوی	* عبدالحلیم شرر
* شیخ عبدالقادر	* اقبال	* ابوالکلام آزاد
* سجاد حیدر یلدرم	* آغا شاعر قزلباش	* ظفر علی خان
* مرزا محمد سعید	* خوشی محمد ناظر	* غلام بھیک نیرنگ
* مہدی افادی	* لطیف الدین احمد	* خواجہ حسن نظامی
* سجاد انصاری	* خلیق دہلوی	* حجاب امتیاز علی
* امتیاز علی تاج	* نیاز فتح پوری	* قاضی عبدالغفار
* مجنوں گورکھپوری	* میرزا ادیب	* ناصر نذیر فراق دہلوی
* عشرت لکھنوی	* چوہدری افضل حق	* چراغ حسن حسرت
* فلک پیما	* ل۔احمد اکبر آبادی	* خاں احمد حسین خاں
* حکیم احمد شجاع	* عابد علی عابد	* عظیم بیگ چغتائی
* حفیظ جالندھری	* عظمت اللہ خاں	* جوش ملیح آبادی
* اختر شیرانی	* علی اختر حیدر آبادی	* اختر انصاری
* حامد اللہ افسر	* روش صدیقی	* ساغر نظامی
* احسان دانش	* الطاف مشہدی	* عبدالرحمٰن بجنوری
* عبدالماجد دریابادی	* فراق گورکھپوری	

رومانیت اور منطق دونوں کے حاملین ناقدین

* رشید احمد صدیقی * آل احمد سرور * خورشید الاسلام
* ابواللیث صدیقی * سید وقار عظیم * عبادت بریلوی
* محمد اکرام

رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا کے چند اہم اقوال

- تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔ (نیاز فتح پوری)
- شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ یہ مشہور بات ہے لیکن اگر شاعر اسی نظریے پر بھروسہ کر کے شعر کہے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ (نیاز فتح پوری)
- شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں اسی طرح شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ (عبدالرحمٰن بجنوری)
- سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتا۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ تو چل سکتے ہیں لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ (مہدی افادی)
- فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے...... شیطنیت ایک ہیئت ارتقائی ہے اس لیے زیادہ مستحکم ہے...... انسان نہ حق ہے اور نہ باطل۔ اس کا وجود محض فریب کائنات ہے۔ (سجاد انصاری)
- ہر زمانے میں عورت کا مقیاس الشباب دائرہ حسن کا مرکز رہا ہے............ عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہوگی...... سینہ کا حصہ افقی بالکل کھلا اور اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے کہ سرکشی لباس کی ممنون نہیں۔ (مہدی افادی)



(9) سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک

- نام سید احمد خان تھا اور خطاب جواد الدولہ عارف جنگ
- سرسید 5 ذوالحجہ 1233ھ مطابق 17 اکتوبر 1817 کو اپنے نانا خواجہ فرید کی حویلی واقع دلی میں پیدا ہوئے۔
- سرسید کا انتقال 27 مارچ 1898 کو علی گڑھ میں ہوا اور دار العلوم کی مسجد کے شمالی گوشے کے احاطہ میں دفن ہوئے۔
- سرسید کا جب انتقال ہوا تو محسن الملک نے ان کے ملازم عظیم کو پچاس روپے دیے جن سے ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور کہا کہ یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کب مانگنے آئیں گے۔
- سرسید کے والد کا نام میر متقی تھا اور والدہ کا عزیز النسا بیگم
- نانا کا نام خواجہ فرید الدین تھا جنھیں مغلیہ دربار سے دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا خطاب ملا تھا۔
- سرسید کے دادا سید ہادی تھے۔عزیز الدین عالمگیر ثانی نے 1168ھ میں انھیں ''جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دواسپہ وسہ اسپہ'' کے خطاب سے نوازا تھا اور شاہ عالم ثانی نے اس خطاب میں 'جواد الدولہ' کا اور اضافہ کیا تھا۔
- سرسید کے بڑے بھائی کا نام سید محمد خان تھا جنھوں نے 1836 میں سید الاخبار نکالا تھا۔
- سرسید کے والد کا انتقال 1838 میں ہوا اس وقت سرسید اکیس سال کے تھے۔
- سرسید نے اسلامی تعلیم مولوی فیض الحسن مولوی نوازش علی اور مولانا مخصوص اللہ سے حاصل کی تھی۔
- سرسید کی شادی پرشا بیگم سے ہوئی تھی۔
- 1861 میں مراد آباد میں سید احمد خان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اس وقت سید احمد خان کی عمر 44 برس تھی جن سے دولڑکے سید حامد اور سید محمود اور ایک لڑکی تھی۔
- سرسید احمد خان نے منصفی کا امتحان 1840 میں پاس کیا تھا۔
- سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی' غازی پور میں 1862 میں قائم کی تھی اور ترجمے کا کام شروع کرایا تھا اور سرسید اس کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔
- سرسید نے غازی پور میں ایک انگریزی مدرسہ 1863 میں قائم کیا تھا۔

تھے۔ لے گئے میں 1864 علی گڑھ اور عملہ سارا سامان سوسائٹی کا سائنٹفک سرسید

- سرسید سائنٹفک سوسائٹی کا سارا سامان اور عملہ علی گڑھ 1864 میں لے گئے تھے۔
- سرسید نے 'علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن' 10 مئی 1866 میں قائم کیا تھا۔
- سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی سے ہفتہ وار اخبار' کا اجرا علی گڑھ میں 1866 میں کیا تھا جس کا نام بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا تھا۔
- سرسید 15 اگست 1867 کو جج کی حیثیت سے جب علی گڑھ سے بنارس گئے تھے تو علی گڑھ میں سائنٹی فک سوسائٹی کی ساری ذمہ داری راجہ جے کشن ایس سی ایس آئی کے سپرد کی تھیں۔
- سرسید نے اردو کے ترسیلی امکانات اور اس کے ابلاغی قوتوں کا احساس دلایا تھا۔
- حکومت نے 1868 میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے 9 اسکالرشپ منظور کیے تھے اور اضلاع شمال مغرب سے سید محمود کا انتخاب کیا تھا۔
- سرسید نے بھی بیٹے کے ساتھ ولایت جانے کا ارادہ کیا۔ اپنے سفر خرچ و قیام کے لیے سرسید نے اپنا کتب خانہ فروخت کر دیا اور ساتھ ہی گھر کو بھی گروی رکھ دیا۔
- سرسید دفتر سے چھٹی لے کر چار افراد یعنی اپنے دونوں بیٹے سید حامد و سید محمود، خداداد بیگ اور خدمت گار چھجو کے ساتھ یکم اپریل 1869 کو بنارس سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔
- سرسید نے انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ، ڈیوک، چارلس ڈکنز، کارلائل سے ملاقات کی تھی۔
- سرسید ایک سال پانچ ماہ یعنی سترہ مہینے لندن میں قیام کر کے 4 ستمبر 1870 کو ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔
- سرسید 2 اکتوبر 1870 کو بمبئی پہنچے تھے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنا سرکاری منصب سنبھال لیا تھا۔
- سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے کی تیاری کے لیے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان بنارس میں قائم کی تھی۔
- سرسید نے لندن ہی سے 'تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان' کی اشاعت کے لیے ایک اشتہار چھپوا کر اپنے چلنے سے پہلے محسن الملک سید مہدی علی کو بھجوا دیا تھا۔
- سرسید نے انگلستان سے واپس ہونے کے بعد لوگوں کی اصلاح اور تہذیب و تربیت کے لیے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے اخبار اڈیسن اور اسٹیل سے متاثر ہو کر تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' کا پہلا شمارہ 24 دسمبر 1870 کو بنارس سے اس لوح اور بیل کے ساتھ جو وہ لندن سے بنوا کر لائے تھے شائع ہوا تھا۔

- ’تہذیب الاخلاق‘ کے ایڈیٹر اور منیجر سرسید احمد خان تھے۔
- ’تہذیب الاخلاق‘ تین بار بند ہوا تھا۔
- پہلی بار تہذیب الاخلاق 1876 میں بند ہوا تھا۔
- ’تہذیب الاخلاق‘ کا دوبارہ اجرا 1879 میں ہوا تھا۔
- ’تہذیب الاخلاق‘ دوبارہ بند 1881 میں ہوا تھا۔
- تہذیب الاخلاق‘ کا تیسری بار اجرا 1894 میں ہوا تھا۔
- ’تہذیب الاخلاق‘ تیسری بار بند ہو کر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم 1897 میں ہوا تھا۔
- ’تہذیب الاخلاق‘ کی مخالفت میں مولوی امداد علی پیش پیش تھے جنھوں نے اس کے جواب میں امداد الآفاق نام کا رسالہ نکالا تھا۔
- تہذیب الاخلاق کے جواب اور رد میں مولوی علی بخش خان بہادر کے دو رسالے شہاب ثاقب اور تائید الاسلام، نور الآفاق، اسٹیجی گزٹ (مراد آباد)، لوح محفوظ (مراد آباد)، تیرہویں صدی (آگرہ)، نجم الاخبار، (مراد آباد)، اکمل الاخبار وغیرہ رسائل و اخبارات نکلے تھے۔
- دسمبر 1870 میں سرسید نے انعامی اشتہار شائع کیا تھا اور 26 دسمبر 1870 کو ’کمیٹی خواستگار ترقی مسلمان‘ کا پہلا اجلاس بلایا تھا جس میں سرسید سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔
- سرسید نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد 1875 میں رکھی تھی اور 24 مئی 1875 کو ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے دن مدرسہ کا افتتاح ہوا تھا اور یکم جون 1875 سے تعلیم شروع ہو گئی تھی۔
- 8 جنوری 1877 کو سہ پہر کے وقت لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل الہند کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور ایک سال بعد یکم جنوری 1878 کو کالج میں کلاس شروع ہوئی تھی اس طرح مدرسۃ العلوم ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہو گیا۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا الحاق کلیۃ الہ آباد یونیورسٹی سے ہوا تھا۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا تھا۔
- سرسید 1876 میں پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تھے۔
- سرسید ایجوکیشن کمیشن کے رکن 1882 میں مقرر ہوئے تھے۔
- سرسید نے ’محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن 1883 میں قائم کی تھی۔
- سرسید نے ’محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس 1886 میں قائم کی تھی۔
- سرسید کو لارڈ ڈفرن نے پبلک سروس کمیشن کا ممبر 1897 میں مقرر کیا تھا۔

- اکبرالہ آبادی نے سرسید اور علی گڑھ تحریک کی کھل کر مخالفت کی تھی۔
- غیرمتوازن روحانی تصورات کے خلاف سرسید نے آواز اٹھائی تھی۔

اعزازات وخطابات

- حکیم احسن اللہ خان کے کہنے پر بہادر شاہ ظفر نے سرسید کے موروثی خطاب جوادالدولہ میں عارف جنگ کا اضافہ 1842 میں کیا تھا۔
- سرسید کو سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ انڈیا آفس لندن کی ایک تقریب میں 6 اگست 1869 کو دیا گیا تھا۔
- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں منعقد ایک جلسے میں سید احمد کو 1888 میں 'نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند' دیا گیا اور سید احمد سرسید احمد ہو گئے۔
- سرسید احمد خان کو ایڈنبرا یونیورسٹی نے "ڈاکٹر آف لا" کی اعزازی سند 1889ء میں دی تھی۔

اردو کے عناصر خمسہ (مہدی افادی کے مطابق)

(1) سرسید احمد خان، (2) الطاف حسین حالی (3) محمد حسین آزاد، (4) شبلی نعمانی، (5) نذیر احمد

سرسید کے دیگر رفقا: سید مہدی علی خان جن کا خطاب محسن الملک تھا، مولوی چراغ علی، خان بہادر، شمس العلماء مولوی ذکا اللہ، سمیع اللہ خان، عنایت اللہ خان، وقار الملک اعظم جنگ، حاجی محمد اسمٰعیل۔

سرسید کے دیگر کارنامے

* **جام جم (فارسی):** یہ سرسید کی پہلی تصنیف ہے جو 1840 میں شائع ہوئی۔ اس میں سرسید نے امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک، سترہ عنوانات کے تحت 43 بادشاہوں کا مختصر حال وتعارف درج کیا ہے۔
* **قواعد صرف ونحو زبان اردو:** سرسید نے 'اہالیان سرکار کمپنی' کی فرمائش پر اردو زبان کی قواعد صرف ونحو لکھی تھی۔
* **'انتخاب الاخوین'** قوانین دیوانی، کا وہ خلاصہ جو سرسید نے منصفی کے امتحان کے لیے تیار کیا تھا اور جسے بعد میں اپنے بڑے بھائی اور اپنے نام سے 1841 میں شائع کر دیا تھا۔
* **جلاء القلوب بذکر المحبوب:** یہ مولود شریف ہے جو محفل میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہے اور

جس میں معتبر و مستند روایات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ 1255ھ/1839 میں سرسید نے تصنیف کیا تھا اور 1843 میں شائع ہوا تھا۔

* **تحفۂ حسن:** شاہ عبدالعزیز کی فارسی تالیف تحفہ اثناعشریہ کے دو ابواب، دس اور گیارہ کا اردو ترجمہ ہے جسے سرسید نے 1260ھ/1844 میں کیا۔
* **تسہیل فی جراثقیل**
* **فوائدالافکار فی اعمال الفرجار**
* **قول متین در ابطال حرکت زمین**
* **آثار الصنادید:** یہ سرسید کی ایک اچھوتی اور شاہ کار تصنیف ہے جو پہلی بار مطبع سیدالاخبار سے 1847 میں شائع ہوئی۔ اس میں دہلی کی تاریخی عمارتوں اور نامور لوگوں کے حالات بہت چھان بین کے بعد لکھے گئے ہیں۔ 1847 کا یہ ایڈیشن چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل 'شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں' لکھا گیا ہے اور جو 135 عمارتوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ باب دوم 'قلعہ معلیٰ کی عمارت کے حال' میں لکھا گیا ہے جو 39 عمارتوں کے بیان پر مشتمل ہے، باب سوم 'میں خاص شہر شاہ جہان آباد' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ باب چہارم دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان پر مشتمل ہے جن کی کل تعداد 128 ہے۔
* آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن 1854 میں اسٹینڈرڈ پریس سے شائع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن سرسید نے ازسرنو تیار کیا تھا۔
* آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن 1847 اور دوسرے ایڈیشن 1854 میں جیسا خود سرسید نے بھی لکھا ہے نمایاں فرق ہے۔
* چوتھا باب دوسرے ایڈیشن 1854 میں نہیں ہے۔
* فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے 1861 میں آثار الصنادید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا تھا جس کی بنا پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید احمد خان کو اپنا اعزازی فیلو منتخب کیا تھا۔
* مسٹر رابرٹ نے آثار الصنادید کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا۔
* **کلمۃ الحق 1849**
* **راہ سنت در رد بدعت 1850**
* **نمیقہ در بیان تصور شیخ 1852**
* **سلسلۃ الملوک 1852:** ان 202 راجاؤں اور بادشاہوں کی (راجا یدھشٹر سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک)

کی مفید، مختصر اور صحیح فہرست جو دلی پر پانچ ہزار سال تک حکمرانی کرتے رہے۔ یہ وہی فہرست ہے جو آثار الصنادید کے 1854 والے ایڈیشن کے پہلے باب کے ساتھ، نظر ثانی کے بعد شامل کی گئی ہے۔

* آغاز کیمیائے سعادت 1853
* تاریخ ضلع بجنور، حکومت ہند کے کہنے پر بجنور میں 'تاریخ ضلع بجنور' لکھی گئی یہ اب ناپید ہے۔
* آئین اکبری' از ابوالفضل: یہ تین جلدوں پر مشتمل تھی جن میں سے دوسری جلد 1857 کے ہنگامے میں تلف ہوگئی۔ اب صرف پہلی اور تیسری جلد مطبوعہ 1272ھ مل جاتی ہیں۔ انگریزی و فرانسیسی میں اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ مسٹر بلاک کا انگریزی ترجمہ 1873 میں شائع ہوا۔
* آئین اکبری کو سرسید نے مرتب کر کے مرزا غالب سے اس کی تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔
* مرزا غالب کی مثنوی بطور تقریظ 'آئین اکبری' کے لیے ہی لکھی گئی تھی جسے سرسید نے شامل نہیں کیا کہ یہ در حقیقت تقریظ نہیں تھی۔
* تاریخ سرکشی بجنور: مرادآباد میں لکھی گئی۔ سال اشاعت 1858۔ اس کتاب میں سرسید نے مئی 1858 سے اپریل 1858 تک غدر کے وہ تاریخی واقعات و حالات قلم بند کیے ہیں جو ضلع بجنور میں پیش آئے۔
* رسالہ 'اسباب بغاوت ہند': یہ کتاب مرادآباد میں لکھی گئی اور 1859 میں اسے چھپوا کر انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبر اور حکومت ہند کو بھجوا دیا گیا۔ یہ رسالہ عام پبلک کے لیے شائع نہیں کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ 1857 کے واقعات کا مستند حوالہ و مآخذ ہے۔
* رائے در باب تعلیم 1850
* رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا
* تحقیق لفظ نصاری
* تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام (تبیین الکلام میں سرسید نے توریت انجیل اور قرآن کا تقابلی مطالعہ کیا ہے)
* تاریخ فیروز شاہی
* توزک جہانگیری: سرسید غازی پور میں اپنی نجی پریس سے 1280ھ/1863 میں مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر کا روزنامچہ 'توزک جہانگیری' میرزا محمد ہادی کے فارسی دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔
* سیرت فریدیہ: 1896 سرسید نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کے حالات زندگی اس تصنیف میں تحریر کیے ہیں۔

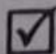
* رسالہ احکام طعام اہل کتاب
* **سفرنامہ مسافران لندن:** یہ سفرنامہ 1869 میں اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں شائع ہوتا رہا۔ کتابی صورت میں پہلی بار اسے 'مجلس ترقی ادب' لاہور نے 1961 میں شائع کیا۔ اس میں سرسید نے اپنے سفر و قیام لندن کو بیان کیا ہے۔
* سفرنامہ پنجاب: 22 جنوری 1844 کو یہ سفر شروع ہوا۔ مولف رسالہ سید اقبال علی سرسید کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے سرسید کی تمام تقریروں اور یادداشتوں کو دورانِ سفر مرتب کیا اور 1884 / 1301ھ میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے شائع ہوا۔
* 'الخطبات االاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ' سر ولیم مور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' (میور کی کتاب چار جلدوں میں ہے) کا جواب ہے جو سرسید نے 1869 میں لندن کے قیام کے دوران لکھی اور انگریزی میں 1870 میں وہیں چھپوایا پھر خطبات احمدیہ کے نام سے 1887 میں اردو زبان میں شائع ہوئی۔ خطبات احمدیہ 12 خطبات پر مشتمل ہے۔
* خطباتِ احمدیہ کا موضوع سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
* رسالہ ابطال غلامی * تفسیر القرآن

سرسید کے اقوال

- فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔
- میر امن کو اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو میر تقی میر کو شاعری میں حاصل ہے۔

سرسید کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- سرسید نے آورد اور تصنع سے بچنے کے لیے گرامر کی بھی پروا نہ کی۔ (حالی)
- حالی نے اردو نثر کا مورث اعلیٰ سرسید کو قرار دیا ہے۔
- بعض لوگ سرسید کو 'اخوان الشیاطین' کا نمائندہ کہتے تھے۔
- اردو انشا پردازی کے مجدد اور امام سرسید ہیں۔ (شبلی)
- پنجاب کے مسلمان سرسید کے منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر۔ (حالی)



(10) ترقی پسند تحریک

پس منظر، ابتدا اور اختتام

- ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں 1936ء میں ہوا تھا۔
- لیکن ترقی پسند تحریک کے قیام کا ابتدائی اعلان احمد علی، محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کے مشورے سے 1933ء میں کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند تحریک حیدرآباد میں منعقد ہونے والی آٹھویں کل ہند کانفرنس کے بعد 1956 میں ختم کردی گئی تھی۔ (تخلیقی مصنف اور ترقی پسند مصنفین از احمد علی، سیپ کراچی، شمارہ 4)
- ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی، لندن، کراچی اور لکھنؤ میں 1986 میں منعقد کی گئی تھی۔

(اردو ادب کی مختصر تاریخ از انور سدید، صفحہ 428)

- دسمبر 1932ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے 'انگارے' کو ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔

انگارے

- افسانوی مجموعہ 'انگارے' احمد علی (دو افسانے)، سجاد ظہیر (پانچ)، رشید جہاں (دو افسانے) اور محمود الظفر (ایک افسانہ) کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے۔
- یہ نوجوان مصنف (انگارے میں لکھنے والے افسانہ نگار) زندگی کی بے کیفی اور یک رنگی سے گھبرائے اور جذباتی انقلابی تصورات سے بھرے ہوئے تھے۔ (احتشام حسین)
- انگارے کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔ (سجاد ظہیر)
- عزیز احمد نے 'انگارے' کو سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ قرار دیا ہے۔
- عزیز احمد کے مطابق انگارے کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔
- نیاز فتح پوری اور عبدالماجد دریابادی نے انگارے کی مخالفت میں مضامین لکھے تھے۔
- انگارے کو مارچ 1933ء میں ضبط کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند تحریک کو اولین فکری اساس اختر حسین رائے پوری کے مقالہ 'ادب اور زندگی' نے فراہم کی تھی جس میں گورکی اور ٹالسٹائی کے خیالات کو اردو داں طبقے میں متعارف کرانے کی کاوش کی گئی تھی۔

- مضمون ادب اور زندگی رسالہ اردو میں جولائی 1935 میں شائع ہوا تھا۔
- یورپ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے جن ہندوستانی طلبہ نے جرمنی کے ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی تھی ان طلبہ کی جماعت نے ایک ادبی حلقے کی شکل 1935ء میں اختیار کی تھی۔
- اس ادبی حلقے میں اردو کے ادیب سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر، انگریزی زبان کے ادیب اور ناول نگار ملک راج آنند، بنگالی کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پُرمود سین گپتا شامل تھے۔
- ان طلبہ نے ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن بنانے کے خیال سے پہلا باقاعدہ جلسہ لندن کے نان کنگ ریسٹوراں میں کیا تھا اور اس انجمن کا نام 'ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن' (Indian Progressive Writter's Association) رکھا تھا۔
- اس انجمن کی تشکیل کے لیے باقاعدہ ایک مینی فسٹو (منشور) لندن ہی میں تیار کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے صدر ملک راج آنند منتخب ہوئے تھے۔
- ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر کا نام اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تحریک کا عروج ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا مرہون منت ہے۔
- ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اولین تحریک تھی جس کے لیے ایک باضابطہ منشور (منی فسٹو) تحریر کیا گیا تھا۔
- لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فسٹو (منشور) تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس۔ سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔
- لندن میں انجمن کے ایک جلسے میں ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی (ماہر لسانیات) نے شرکت کی تھی اور رومن رسم الخط کی حمایت میں ایک تقریر کی تھی۔

مقصد

- اس پہلے مینی فسٹو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد یہ درج ہے کہ "اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کرسکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی وتنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے

ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔

- ان جیسے مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی تھیں:

(1) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ ان انجمنوں کے درمیان اجتماعی اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط و تعاون پیدا کرنا، صوبوں کی، مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

(2) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(3) ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو۔ جس سے ہم تہذیبی پسماندگا کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(4) ہندوستان کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(5) فکر و نظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا۔

(6) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا، عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔

انجمن کے متعلق اہم معلومات

- اس پہلے مینی فیسٹو کو ہندوستان میں پریم چند نے سب سے پہلے خوش آمدید کہا تھا۔
- پریم چند نے اس مینی فیسٹو کو اپنے رسالہ 'ہنس' میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں ان مقاصد کی حمایت کی تھی اور کہا تھا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔
- لندن کی انجمن نے اپنا جو مینی فسٹو تیار کیا تھا اسے سائیکلو اسٹائل کر کے سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر ، رشید جہاں، پروفیسر ہیرن مکرجی اور احمد علی کو بھیج کر ان کی رائے دریافت کی تھی۔
- 1935 میں سجاد ظہیر کے ہندوستان واپس آنے کے بعد الہ آباد میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما، احتشام حسین اور سید وقار عظیم نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی تھی۔
- دسمبر 1935 میں الہ آباد میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے سجاد ظہیر کے کہنے پر انجمن کے مقاصد سے اتفاق کیا تھا اور انجمن کے مینی فیسٹو پر اپنے دستخط کیا تھا۔

- ہندوستان میں سب سے پہلے الہ آباد میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا۔
- علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ خواجہ منظور حسین کے مکان پر 1936 کے اوائل میں ہوا تھا جس میں علی سردار جعفری نے 'جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات' پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔
- علی گڑھ میں علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف وغیرہ نے اس تحریک کو تقویت بخشی تھی۔
- حیدرآباد میں سبط حسن نے ادیبوں کو ترقی پسند تحریک کے لیے منظم کیا تھا۔
- ہیرن مکرجی نے بنگال کے ادیبوں سے تبادلۂ خیال کر کے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی تھی۔
- امرتسر، لاہور اور پنجاب میں فیض احمد فیض، محمود الظفر، رشید جہاں، اختر شیرانی، غلام مصطفیٰ تبسم، میاں افتخار الدین اور فیروز الدین منصور نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔
- بہار میں سہیل عظیم آبادی، تمنائی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کیا تھا۔
- لاہور میں 1937ء میں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے علامہ اقبال سے ملاقات کر کے تحریک کے مقاصد ان کے سامنے رکھے جس پر علامہ نے بڑی ہمت افزائی کی تھی اور کہا تھا کہ ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے۔

پہلی کل ہند کانفرنس

- ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس 15/اپریل 1936ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔
- اس کانفرنس میں پریم چند کے علاوہ حسرت موہانی، جے پرکاش نرائن، کملا دیوی، چٹوپادھیائے، میاں افتخار الدین، یوسف مہر علی، اندولال یاجنک اور جیننڈر کمار وغیرہ نے شرکت کی تھی۔
- اس پہلی کل ہند کانفرنس میں سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری چنا گیا تھا۔
- ترقی پسند تحریک کو سب سے زیادہ تقویت اس خطبے سے ملی تھی جو اس کانفرنس میں پریم چند نے صدارت کرتے ہوئے پڑھا تھا۔

پریم چند کے خطبۂ صدارت کے چند اہم نکات

- ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔
- جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس، شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا

ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود و انحطاط کا شکار ہو چکی ہے۔

- مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔
- ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔
- ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔
- ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ حاضر طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لیے کافی ہے۔
- ہم دوسری زبانوں اور ادیبوں کے دستر خوان کے جھوٹے نوالے ہی کھانے پر قناعت نہ کریں بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔
- جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ، حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔
- ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے تخریب نہیں۔
- ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔
- اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد روی ہے۔
- پریم چند نے اپنا خطبہ ختم کرتے ہوئے آخر میں یہ الفاظ کہے تھے:

> "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔

- پہلی کل ہند کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تقریر کی تھی اور انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور اس کے اعلان نامے سے پورا اتفاق کیا تھا۔

حسرت موہانی کی تقریر کے چند اہم نکات

- ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے

والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہیے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنا چاہیے۔

- محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
- پہلی کل ہند کانفرنس میں اعلان نامے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی بھی پیش کیا گا تھا جو بالاتفاق منظو ہوا تھا۔
- انجمن کے دستور کا مسودہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا تھا۔
- ترقی پسند ادیبوں نے اس پہلی کل ہند کانفرنس کے اجلاس میں دو قراردادیں بھی پاس کی تھیں۔
- پہلی قرارداد میں مسولینی کے حبش پر جارحانہ حملے کی مذمت کی گئی تھی۔
- دوسری قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ادیبوں اور صحافیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مکمل آزادی دے۔
- پہلی کل ہند کانفرنس میں فراق گورکھپوری نے 'انیسویں اور بیسویں صدی کی تہذیبی اور اصلاحی تحریکوں' پر اور احمد علی نے 'ترقی پسند ادب' پر مقالہ پڑھا تھا۔
- سروجنی نائیڈو نے پہلی کل ہند کانفرنس کے لیے ایک پیغام بھیجا تھا جو پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس

- پہلی کل ہند کانفرنس کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں پہلی کانفرنس 1937ء میں کی تھی۔
- الہ آباد کی پہلی کانفرنس کی مجلس صدارت کے لیے آچاریہ نریندر دیو، پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق کے نام منتخب کیے گئے تھے۔
- الہ آباد کی اس پہلی کانفرنس کے لیے مولوی عبدالحق نہ آسکے تھے لیکن انھوں نے اپنا خطبہ صدارت بھیج دیا تھا۔

الہ آباد کی دوسری کانفرنس

- ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں دوسری کانفرنس مارچ 1938ء میں منعقد کی تھی۔
- الہ آباد کی دوسری کانفرنس میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، مجاز، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا، پریم چند کے صاحب زادے امرت رائے، شاہد لطیف، علی اشرف، فراق، اعجاز حسین، احتشام حسین اور وقار عظیم شریک ہوئے تھے۔

- الہ آباد کی دوسری کانفرنس کی مجلس صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی، آنند نرائن ملا اور ہندی کے مشہور شاعر سمترا نندن پنت کا نام چنا گیا تھا۔
- الہ آباد کی دوسری کانفرنس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے تقریر کی تھی۔
- الہ آباد کی دوسری کانفرنس کے لیے رابندر ناتھ ٹیگور نے ترقی پسند ادیبوں کے نام ایک پیغام بھیجا تھا۔
- الہ آباد کی دونوں کانفرنسوں کے علاوہ ترقی پسند ادیبوں نے دہلی اور ہری پورہ میں بھی دو اہم جلسے کیے تھے۔
- دہلی کے جلسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کونسل نے اسپین کی جمہوریت پسندوں کی حمایت اور فاشت فرانکو کی مخالفت میں ایک قرارداد پاس کیا تھا۔
- ہری پورہ کے جلسے کی صدارت سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔

دوسری کل ہند کانفرنس

- ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس دسمبر 1938 میں کلکتہ میں ہوئی تھی۔
- دوسری کل ہند کانفرنس کے افتتاح کے لیے رابندر ناتھ ٹیگور کو بلایا گیا تھا جو بیمار ہونے کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔
- دوسری کل ہند کانفرنس کی صدارت ملک راج آنند نے کی تھی۔
- دوسری کل ہند کانفرنس میں جو کلکتہ میں ہوئی تھی سجاد ظہیر، احمد علی، عبدالعلیم، کرشن چندر، مجاز اور سردار جعفری وغیرہ شریک ہوئے تھے۔
- ترقی پسند ادیبوں نے اپنا رسالہ 'نیا ادب' کے نام سے لکھنؤ سے 1939ء میں شائع کیا تھا۔

تیسری کل ہند کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد کی گئی تھی۔
- تیسری کل ہند کانفرنس کی صدارت ڈاکٹر عبدالعلیم نے کی تھی۔
- تیسری کل ہند کانفرنس میں ترقی پسند ادیبوں میں سے سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم مسرور، کرشن چندر، مجاز، سردار جعفری، سبط حسن اور رشید جہاں شامل تھے۔
- تیسری کل ہند کانفرنس میں حلقۂ ارباب ذوق لاہور سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں سے ن، م راشد، میراجی، مولانا صلاح الدین احمد اور قیوم نظر بھی شامل تھے۔ جو ادب کی افادیت کے منکر تھے اور ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپیگنڈہ کہتے تھے۔ تیسری کل ہند کانفرنس میں مولانا

عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔

- تیسری کل ہند کانفرنس کا اجلاس ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں ہوا تھا۔
- تیسری کل ہند کانفرنس کے اجلاس میں ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی گئی تھی جس میں ادیبوں اور فنکاروں نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں اور فاشزم کے خلاف ہیں۔
- ترقی پسند ادیبوں نے دہلی میں ہونے والی تیسری کل ہند کانفرنس میں دوسری جنگ عظیم کے متعلق جو پالیسی بنائی تھی اس کی حمایت میں جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کے مشترکہ بیانات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔

چوتھی کل ہند کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی چوتھی کل ہند کانفرنس اکتوبر 1945ء میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔
- چوتھی کل ہند کانفرنس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ یہ کانفرنس لگاتار پانچ دن تک رہی تھی۔
- چوتھی کل ہند کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کے علاحدہ علاحدہ صدر چنے گئے تھے۔
- اردو ہندی کے مسئلے پر چوتھی کل ہند کانفرنس کا جو اجلاس ہوا تھا اس کی صدارت ڈاکٹر تاراچند نے کی تھی۔
- شاعری پر چوتھی کل ہند کانفرنس کا جو اجلاس ہوا تھا اس کی صدارت فراق گوگھپوری نے کی تھی۔
- جرنلزم پر چوتھی کل ہند کانفرنس کا جو اجلاس ہوا تھا اس کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی تھی۔
- تنقید پر چوتھی کل ہند کانفرنس کا جو اجلاس ہوا تھا اس کی صدارت احتشام حسین نے کی تھی۔
- چوتھی کل ہند کانفرنس کے عام جلسے کی صدارت حسرت موہانی نے کی تھی۔
- چوتھی کل ہند کانفرنس میں سجاد ظہیر نے 'اردو، ہندی، ہندوستانی'، سبط حسن نے 'اردو جرنلزم کا ارتقا'، سردار جعفری نے 'اقبال کی شاعری'، احتشام حسین نے 'اردو میں ترقی پسند تنقید' اور ساحر لدھیانوی نے 'اردو کی انقلابی شاعری' کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔
- چوتھی کل ہند کانفرنس میں ہی ڈاکٹر عبدالعلیم نے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی تھی۔
- اس قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ اردو ادب میں اس وقت فحاشی کے جو رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں ان کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی مخالفت کی تھی۔
- اس تجویز کی قاضی عبدالغفار اور حسرت موہانی نے مخالفت کی تھی۔
- حسرت موہانی نے کہا تھا کہ ''ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسنا کی کا اظہار کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس پر یہ قرارداد مسترد ہو گئی تھی۔

پانچویں کل ہند کانفرنس یا تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس دسمبر 1947ء میں پہلی کانفرنس کی طرح لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یعنی پہلی اور پانچویں کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کے مختلف اجلاس گنگا پرساد میموریل ہال میں تین دن تک ہوتے رہے تھے۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کے افتتاح کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو بلایا گیا تھا لیکن ان کے عین وقت پر نہ آنے کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود نے افتتاح کی رسم ادا کی تھی۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت جو عام جلسہ تھا قاضی عبدالغفار نے کی تھی۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کی مجلس مقالات کی صدارت پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کی تھی۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت جو زبان کے مسئلے سے متعلق تھا نیاز فتح پوری نے کی تھی۔
- مشاعرے کی صدارت جعفر علی خان اثر لکھنوی نے کی تھی۔
- پانچویں کل ہند کانفرنس کی مکمل روداد اور اس میں پڑھے جانے والے مضامین نظم و نثر کو جمع کر کے صہبا لکھنوی نے افکار (بھوپال) کا ایک خاص نمبر شائع کیا تھا۔

چھٹی کل ہند کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس مئی 1949ء بھی بھیمڑی (ممبئی کا علاقہ) میں منعقد ہوئی تھی۔
- چھٹی کل ہند کانفرنس کی صدارت ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر رام بلاس شرما نے کی تھی۔
- چھٹی کل ہند کانفرنس میں ترقی پسند ادیبوں نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں 1936 کے مینی فسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فسٹو منظور کیا تھا۔
- بھیمڑی کی کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے اپنا جو نیا منشور پیش کیا تھا اس سے اس تحریک کو فائدہ پہنچنے کے بجائے بعض ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کے نتائج ترقی پسند

ادیبوں کی اس تحریک اور ادبی تخلیقات کی پیداوار دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوئے۔

- نئے منشور (مینی فسٹو) کی اشاعت کے بعد بیزاری اور برہمی کا سب سے پہلا اظہار سردار جعفری کی طرف سے ان شاعروں پر ہوا تھا جو اپنے آرٹ میں رمزیت اور تغزل کے قائل ہیں۔
- چھٹی کل ہند کانفرنس میں ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔

ساتویں کل ہند کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی ساتویں کل ہند کانفرنس مارچ 1952ء میں تیسری کی طرح دہلی میں ہوئی تھی یعنی تیسری اور ساتویں کل ہند کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی۔
- ساتویں کل ہند کانفرنس میں نئے منشور پر نظر ثانی کی گئی تھی۔
- ساتویں کل ہند کانفرنس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔

آٹھویں یا آخری کل ہند کانفرنس

- انجمن ترقی پسند مصنفین کی آٹھویں اور آخری کل ہند کانفرنس مئی 1956ء میں چوتھی کانفرنس کی طرح حیدر آباد میں ہوئی تھی۔

ترقی پسند ادب کی مخالفت

- کلکتہ کے اخبار 'اسٹیٹس مین' نے اپنے اداریے میں ترقی پسند تحریک کو خطرناک بتایا تھا اور اس پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔
- ترقی پسند ادب کی مخالفت میں پہلا مضمون 'نیا ادب کدھر جارہا ہے' کے عنوان سے نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی نے لکھا تھا جو ترقی پسند ادیبوں کے رسالہ 'نیا ادب' کی جنوری فروری 1940ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔
- 'نیا ادب کدھر جارہا ہے' کا جواب سجاد ظہیر نے 'سراج مبین' کے نام سے لکھ کر اکتوبر 1940ء کے 'نیا ادب' میں شائع کرایا تھا۔
- نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے کچھ اور مضامین 'ترقی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل' کے عنوان سے 'ادب لطیف' میں لکھے تھے جس میں مغربی مصنفین کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ادب کا اصل مقصد جمالیاتی حظ ہے۔ اسے سماج کی اصلاح و درستی یا عقائد کی تبلیغ و اشاعت

سے کوئی واسطہ نہیں۔

- جعفر علی خان کے ان مضامین کا جواب فیض احمد فیض نے رسالہ 'ادب لطیف' ہی میں مضمون لکھ کر دیا تھا۔
- ترقی پسند ادبی تحریروں کے سب سے بڑے معترض اور نکتہ چینی پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی ایک طویل مضمون لکھ کر ترقی پسند ادب پر سخت نکتہ چینی کی تھی جو رسالہ 'آفتاب' علی گڑھ کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔

رشید احمد صدیقی کے اس مضمون کے چند اہم اقتباسات

- جدید اور قدیم کی آویزش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ زندگی۔ اس سے نہ ڈرنا چاہیے اور نہ ڈرانا۔
- ادب سنت اللہ نہیں کہ اس میں تبدیلی ناممکن ہو۔
- شعر و ادب انسانوں کی بنائی ہوئی چیز ہے اور انسانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھالتے رہیں۔
- اگر کوئی شعر و ادب قوم و جماعت کی فکر و نظر کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا تو اس شعر و ادب کو جوں کا توں رہنے دینا کبھی کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔
- انقلاب دوستی یا ترقی پسندی کے معنی یہ کب ہوئے اور کیوں کر ہوئے کہ فسق و فواحش اور غارت گری ہی زندگی کا حاصل ہے۔ یہ کیسا آرٹ ہے؟ اور کون سا ادب ہے؟ اور کس قماش کی زندگی ہے جس کا مرکزی اور بنیادی تصور فساد و فحاشی ہو۔
- میرا عقیدہ ہے کہ فحش ہی نہیں ہر بات اس طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مذاقِ سلیم پر بار نہ ہو اور کسی کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اور غیر شاعر، ادیب اور غیر ادیب ایک دوسرے سے علاحدہ اور ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔
- یاد رہے کہ جعفر علی خان اثر، رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد اور حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے تمام ادبا و شعرا ترقی پسند ادب کے سخت مخالف رہے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے شعرا

- اسرار الحق مجاز
- مخدوم محی الدین
- معین احسن جذبی
- علی سردار جعفری
- علی جواد زیدی
- سلام مچھلی شہری
- مسعود اختر جمال
- اختر انصاری
- فراق گورکھپوری
- فیض احمد فیض
- کیفی اعظمی
- جاں نثار اختر

* ساحرلدھیانوی
* احمد ندیم قاسمی
* منیب الرحمٰن
* قتیل شفائی
* نریش کمار شاد
* راہی معصوم رضا
* بلراج کومل
* اختر پیامی
* وحید اختر
* عزیز قیسی
* رفعت سروش
* زبیر رضوی
* مجروح سلطان پوری
* شاد عارفی
* عزیز حامد مدنی
* ابن انشا
* اشعر ملیح آبادی
* باقر مہدی
* شہاب جعفری
* منظر شہاب
* عمیق حنفی
* کمال احمد صدیقی
* شفیق فاطمہ شعری
* جاوید کمال
* اختر الایمان
* پرویز شاہدی
* ظہیر کاشمیری
* تیغ الہ آبادی
* مسعود حسین
* حسن نعیم
* مظہر امام
* قاضی سلیم
* شاذ تمکنت
* منظر سلیم
* حمایت علی شاعر
* انور معظم

ترقی پسند نظریات کے حامل افسانہ نگار

* سجاد ظہیر
* محمود الظفر
* حیات اللہ انصاری
* راجندر سنگھ بیدی
* اختر اورینوی
* دیوندر ستیارتھی
* خواجہ احمد عباس
* خدیجہ مستور
* رضیہ سجاد ظہیر
* کشمیری لال ذاکر
* جیلانی بانو
* مسیح الحسن رضوی
* احمد علی
* پریم چند
* کرشن چندر
* عصمت چغتائی
* اختر انصاری
* بلونت سنگھ
* مہندر ناتھ
* صدیقہ بیگم
* سرلا دیوی
* دیوندر اسر
* اقبال متین
* غیاث احمد گدی
* رشید جہاں
* سہیل عظیم آبادی
* سعادت حسن منٹو
* اوپندر ناتھ اشک
* احمد ندیم قاسمی
* اختر حسین رائے پوری
* ہاجرہ مسرور
* شکیلہ اختر
* انور عظیم
* رام لعل
* کلام حیدری
* ستیش بترہ

ترقی پسند نظریات کے حامل ناول نویس

* پریم چندر
* سجاد ظہیر
* کرشن چندر
* عصمت چغتائی
* عزیز احمد
* رامانند ساگر
* ہنس راج رہبر
* سعادت حسن منٹو

ترقی پسند ڈرامہ نگار

* سجاد ظہیر
* کرشن چندر
* سعادت حسن منٹو
* خواجہ احمد عباس
* اوپندر ناتھ اشک
* مرزا ادیب
* عصمت چغتائی
* راجندر سنگھ بیدی
* ریوتی سرن شرما

طنز و مزاح

* کنہیالال کپور
* کرشن چندر
* ابراہیم جلیس
* فکر تونسوی

ترقی پسند نظریات کے حامل ناقدین ادب

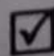
* سجاد ظہیر
* اختر حسین رائے پوری
* احتشام حسین
* محمد حسن
* مجنوں گورکھپوری
* آل احمد سرور
* ڈاکٹر عبدالعلیم
* اختر انصاری
* عزیز احمد
* ممتاز حسین
* سردار جعفری
* وقار عظیم

ترقی پسند تحریک کے متعلق مختلف اقوال

➤ تحریک کے پہلے پانچ سال ادبی اہمیت سے زیادہ تبلیغی اہمیت رکھتے ہیں۔ (آل احمد سرور)

➤ جب سجاد ظہیر کے اعلان نامہ کی نقل ہندوستان کو پہنچی تھی تو اس پر منشی پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، قاضی عبدالغفار، علی عباس حسینی اور فراق گورکھپوری بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دستخط کر دیے تھے۔

(اردو ادب کی تحریکیں: انور سدید، صفحہ 473)



(11) حلقۂ اربابِ ذوق

- حلقۂ ارباب ذوق (مجلس داستان گویاں) کا قیام ترقی پسند تحریک کے قیام کے تقریباً تین سال بعد یعنی 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں سید نصیر احمد جامعی کے گھر پر عمل میں آیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کو بالعموم ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔
- سید نصیر احمد جامعی نے 29 اپریل 1939 کو اپنے گھر پر چند دوستوں یعنی نسیم حجازی، تابش صدیقی، حفیظ ہوشیار پوری، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد اختر وغیرہ کو جمع کر کے ایک ادبی محفل منعقد کی تھی اور اس محفل میں ایک ایسی مجلس کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا تھا جس میں افسانے پڑھے جائیں اور ان پر جدید مغربی تنقید کی روشنی میں تنقید کی جایا کرے اور اس مجلس کا نام ''مجلس داستان گویاں'' رکھا گیا تھا۔
- یاد رہے کہ حلقۂ ارباب ذوق کا ابتدائی نام مجلس داستان گویاں تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدائی نو نشستیں 'مجلس داستان گویاں' نام کے تحت ہی منعقد ہوئی تھیں۔
- 2 ستمبر 1939ء کو منعقد ہونے والے دسویں جلسے میں 'مجلس داستان گویاں' کا نام تبدیل کر کے 'حلقۂ ارباب ذوق' حفیظ ہوشیار پوری کی تجویز پر رکھا گیا تھا۔
- ڈاکٹر محمد باقر نے مخزن اگست 1950ء ص 95 پر شائع ہونے والے مضمون میں لکھا ہے کہ ''سب لوگ متقاضی تھے کہ 'لٹریری سرکل' نام رکھا جائے......لٹریری سرکل کا لغوی ترجمہ 'ادبی حلقہ' ہوتا ہے......ہم سب نے حلقہ کا لفظ بار بار دہرایا اور بالآخر یہ ہمارے حلق سے نیچے اتر گیا۔ اور میری تجویز پر حلقۂ ارباب ذوق نام طے پایا گیا۔
- نوٹ: محمد باقر کے اس بیان کو ''ان کی تجویز پر نام رکھا گیا۔'' قیوم نظر نے درست قرار نہیں دیا ہے۔
- مجلس داستان گویاں کا مقصد کسی نئی تحریک کو وجود میں لانا اور ادب میں موضوع یا ہیئت کا کوئی نیا انقلاب بپا کرنا نہیں تھا بلکہ اس مجلس کی نوعیت تقریب ملاقات کی تھی۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی شاخ دہلی میں قائم کی گئی تھی جس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی مقرر ہوئے تھے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں نے اپنی مجلسوں کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تھی۔

* حلقۂ ارباب ذوق کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوگا
* حلقۂ ارباب ذوق کا صرف ایک مستقل سکریٹری ہوگا۔
* رکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس نہیں لی جائے گی۔
* ہر سال کے لیے ایک سکریٹری چنا جائے گا۔
* حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی اور حلقہ کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہیں حلقے کا رکن بنائیں لیکن حلقے کے اجلاس اس مرد اور عورت کے لیے کھلے ہوں گے جس کو اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔
* حلقے کا جلسہ ہر ہفتے ایک رکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمے سب کو چائے پلانا ہوگا۔
* حلقے کی ہر نشست میں کچھ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں گی جن کو سننے کے بعد ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا فرض ہوگا کہ وہ ناراض ہونے کے بجائے خوش دلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید و اعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔
* حلقہ کی کارروائی کو حتی الوسع مشتہر نہیں کیا جائے گا۔

- حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سید نصیر احمد جامعی، حفیظ ہوشیار پوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی، محمد افضل اور نسیم حجازی وغیرہ شامل ہیں۔
- ابتداً حلقہ اور ارباب ذوق کے جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہر اتوار کو ہوا کرتے تھے۔ 1944 سے ارکان حلقہ کے گھروں کے بجائے ایم سی اے ہال میں منعقد ہونے لگے تھے۔
- پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا تھا اور اس کی صدارت حفیظ ہوشیار پوری نے کی تھی جس میں پہلا افسانہ 'تلافی' نسیم حجازی نے تنقید کے لیے پیش کیا تھا۔
- قیوم نظر اور یوسف ظفر اگر چہ حلقہ کے بانیوں میں سے نہیں تھے لیکن وہ اہم رکن تھے جن کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی حلقہ میں جگہ ملی تھی۔
- مولانا صلاح الدین احمد حلقے سے ادبی وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کی انتظامیہ کے رکن بھی تھے۔
- حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میرا جی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسے میں قیوم نظر کی دعوت پر شرکت کی تھی۔
- یاد رہے کہ میرا جی بھی حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے نہیں تھے لیکن چوں کہ میرا جی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اس لیے حلقۂ ارباب ذوق کا نام لیتے ہی میرا جی کا نام آجاتا ہے۔

میراجی اور حلقے سے متعلق چند اہم اقوال

- قواعد وضوابط کی تنظیم اور پروگراموں کی تشکیل سب کے پس پشت میراج ایک محرک قوت کے طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔(محمود نظامی مقالہ میراجی نقوش،شخصیات نمبرص591)
- ان (میراجی) کی آمد سے حلقے میں نئی روح پیدا ہوگئی۔(شیر محمد اختر)
- نوجوانوں کی اس مجلس میں میراجی کی حیثیت پیر مغاں کی سی تھی۔(محمود نظامی)
- یوسف ظفر نے جلسے کے اختتام پر پڑھی جانے والی نظموں اور غزلوں کے تفریحی پہلو کو ختم کیا اور مضامین کی طرح شاعری پر بھی تنقیدی بحث کی ابتدا کی تھی۔
- شیر محمد اختر حلقے کے ساتھ تادم زندگی وابستہ رہے۔ان کا میدان افسانہ نگاری ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کے نزدیک تجربہ،جدت اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔
- فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقۂ ارباب ذوق نے معاشرہ کے مقابلے میں فرد اور ذات کو اہمیت دی ہے۔
- حلقہ نے تجربے پر اس شرط کے ساتھ زور دیا ہے کہ تجربہ نیا ہو۔
- حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا ہے۔
- حلقہ کے فن کاروں کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جو اپنے ماحول کا عکاس وترجمان بھی ہو اور جس میں روایات کی پاس داری بھی موجود ہو۔
- ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا افسانہ خوانی سے ہوئی تھی۔
- میراجی نے حلقے کا رخ تنقید کی طرف موڑا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے نئی نظم کو فروغ دینے میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں
- حلقۂ ارباب ذوق کے تخلیقی عمل میں اخفا،ابہام اور بعد کو اہمیت حاصل ہے جب کہ تنقید میں حلقہ نے ابہام کے برعکس بے رحم تجزیہ کو اہمیت دیا ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے ترقی پسند تحریک کے 'ادب برائے زندگی' کے مقابلے میں 'ادب برائے ادب' کا نعرہ بلند کیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی تنقیدی جہت کو متعین کرنے کا فریضہ میراجی نے سرانجام دیا تھا۔
- میراجی کا خیال ہے کہ داخلی اور خارجی فنی اصول سے قطع نظر ادب ہر مصنف کی اپنی شخصیت کا

آئینہ ہوتا ہے۔

- میراجی نے بیٹے کو باپ کا عکس قرار دیا ہے اور بیٹے کے کردار سے باپ کے کردار کی خصوصیات تلاش کرنا ممکن تصور کیا ہے۔
- میراجی کے مطابق انسانی زندگی تخیل کے ماتحت ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی تنقید میں قطعیت کا زاویہ وحید قریشی نے پیدا کیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی تنقید کا ایک اہم زاویہ 'مجلسی تنقید' ہے جسے حلقے کی ہفتہ وار مجالس کی بدولت فروغ ہوا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی تنقید کا ایک اہم زاویہ 'مجلسی تنقید' ہے جسے حلقے کی ہفتہ وار مجالس کی بدولت فروغ ہوا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق سے ایک منفی تحریک 'نئی لسانی تشکیلات' کے نام سے ابھری تھی۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے ادبی اجتماعات کے انعقاد کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے فروغ میں بھی اپنا حصہ ادا کیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے 1941ء میں بہترین نظموں کا انتخاب کر کے شائع کیا تھا جس میں احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، ن م راشد، جوش، عدم، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، میراجی، اختر الایمان اور ربیعہ مہدی علی خان وغیرہ کی 24 نظمیں شامل تھیں۔
- حلقہ کے بہترین نظموں کا آخری انتخاب 1949 میں شائع ہوا تھا۔
- حلقہ نے اپنا مرتب کردہ جریدہ 'نئی تحریریں' کے نام سے شائع کیا تھا جس کی پہلی جلد 1948 میں کراچی سے اور دوسری جلد 1954 میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔
- انتہا پسند سرگرمیوں کی وجہ سے انتظار حسین، عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم کو حلقہ کی رکنیت سے علیحدہ کیا گیا تھا۔
- اعجاز حسین بٹالوی نے افسانہ 'گرل فرینڈ' 27 نومبر 1955 کے جلسے میں پیش کیا تھا۔
- منٹو نے 3 ستمبر 1950 سے کئی جلسوں میں اپنے افسانے سنائے تھے جن پر کھل کر تنقید ہوئی تھی۔ 'شاہ دولے کا چوہا' منٹو کا آخری افسانہ تھا جو انھوں نے حلقے کے 30 مئی 1954 کے اجلاس میں پڑھا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق 2 مارچ 1972 کو دو حصوں میں منقسم ہوا تھا۔
- جس گروہ نے قطع تعلق کیا تھا اس نے اپنا نام حلقۂ ارباب ذوق ادبی رکھا تھا۔ یہ گروہ ادب کو خالص

ادب کے حوالے سے جانچتا اور پرکھتا تھا اور دوسرا خالص سیاسی نقطۂ نظر ت۔

- حلقۂ ارباب ذوق پاکستان شاخ لاہور کا قیام 1980 میں عمل میں آیا تھا۔
- 1982 میں تین حلقے اپنے اپنے جلسے منعقد کرنے لگے تھے یعنی تین حلقوں میں تقسیم ہو گیا تھا (1) حلقۂ ارباب ذوق لاہور پاکستان (2) حلقۂ ارباب ذوق سیاسی (3) حلقۂ ارباب ذوق قیوم گروپ

حلقۂ ارباب ذوق کی مخالفت اور اس پر تنقید

- ترقی پسندوں نے اور ان میں خاص طور پر سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے حلقۂ ارباب ذوق کو شدت سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔
- سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' میں حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں کو ہیئت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب قرار دیا ہے جو یورپ کے انحاطی ادب سے متاثر تھے۔
- سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں میراجی کو انگلستان کے جدید رجعت پرستوں کا چربہ قرار دیتے ہوئے حلقۂ ارباب ذوق کی مجہولیت کا ذکر کیا ہے۔

حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا

* میراجی	* ن م راشد	* یوسف ظفر	* قیوم نظر
* تابش صدیقی	* الطاف گوہر	* سردار انور	* اختر ہوشیار پوری
* عظیم قریشی	* تابش دہلوی	* مبارک احمد	* منیب الرحمٰن
* سید فیضی	* بلراج کومل	* اختر الایمان	* مجید امجد
* سلام مچھلی شہری	* بشر نواز	* شاد امرتسری	* شکیب جلالی
* شہزاد احمد	* شہاب جعفری	* محمود ایاز	* عزیز تمنائی
* قاضی سلیم	* سلیم الرحمٰن	* ساقی فاروقی	* عرش صدیقی
* کمار پاشی	* محمد علوی	* عمیق حنفی	* شاذ تمکنت
* ریاض مجید	* انجم رومانی	* ناصر کاظمی	* شہزاد احمد
* شہرت بخاری	* وزیر آغا	* سجاد باقر رضوی	* سلیم شاہد
* احمد مشتاق	* اقبال ساجد	* سیف زلفی	

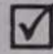
حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ افسانہ نگار

* شیر محمد اختر	* نسیم حجازی	* مولانا صلاح الدین	* رفیع پیرزادہ

* کرشن چندر * اوپندر ناتھ اشک * بیدی * ممتاز مفتی
* محمد حسن عسکری * ڈاکٹر صلاح الدین اکبر * امجد الطاف * غلام علی چودھری
* اشفاق احمد * انتظار حسین * انور سجاد * غلام الثقلین نقوی
* مسعود مفتی * پریم ناتھ در * اعجاز راہی * مرزا حامد بیگ
* مشتاق قمر

حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ ناقدین

* میراجی * مولانا صلاح الدین احمد * وحید قریشی * ریاض احمد
* محمد حسن عسکری * جمیل جالبی * سلیم احمد * ممتاز شیریں
* سجاد باقر رضوی * وزیر آغا * شاد امرتسری * عزیز الحق
* عارف امان * سعادت سعید * آزاد کوثری * زاہد فارانی
* خالد احمد * سراج منیر * یوسف کامران * انتظار حسین
* ناصر کاظمی



(12) جدیدیت

- 1960 کے آس پاس جدیدیت کا رجحان سامنے آیا تھا۔
- جدیدیت جو ایک رجحان یا رویہ ہے اس کا خمیر وجودیت اور تجریدیت سے تیار ہوا تھا۔
- جدیدیت کسی ایک نظریے تک محدود نہیں ہے بلکہ یوروپی مفکرین اور فلسفیوں کے مختلف النوع تصورات اور نظریوں پر مبنی ہے جیسے معرفت پسندی، انفرادیت پسندی، ماورائے حقیقت پسندی، ماورائیت، انکاریت، پیکریت، تاثریت، عملیت، مزاجیت، لایعنیت، شعور کی رو، تحت الشعور، لاشعور اور وجودیت
- 1960 کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے۔
- جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے اس کا اطلاق 1957 کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔
- جدیدیت کی ایک پہچان علامتی اور اشاراتی اسلوب ہے۔
- جدیدیت کی جڑیں، وجودیت کے فلسفے سے ملتی ہیں۔ وجودیت کا فلسفہ انسان کی داخلیت کے ارتقا کو پیش کرتا ہے۔
- فلسفۂ وجودیت میں ساری باتوں کی بنیاد فرد کا شعور ذات ہے۔
- وجودیت کے فلسفے کو سمت و رفتار عطا کرنے میں کانٹ، ہیگل، ڈیوڈ ہیوم اور سارتر کا اہم حصہ ہے۔
- وجود کی عام تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا کسی زمانے میں کسی جگہ پر ہونا یا اس شے کے وجود سے عبارت ہے۔ وجودیت پسند مفکرین اس تعریف کو رد کرتے ہیں ان کے نزدیک وجود سے مراد ہر لمحہ کچھ ہوتے رہنا کچھ بنتے رہنا۔ وجود کا مفہوم 'یہ ہے' ہو ہی نہیں سکتا بلکہ ہو رہا ہے، بن رہا ہے بننے کا عمل جاری ہے۔
- وجودیت کا فلسفہ صرف آدمی یا فرد سے بحث کرتا ہے۔ وہ بھی منفرد آدمی سے۔
- جدیدیت پسند زبان، اسلوب اور تکنیک کو معانی اور موضوع سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
- جدیدیت پسند لکھنے والے غیر مربوط، غیر منطقی اور Non linear بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں۔

- جدیدیت پسند لکھنے والے مشاہدے اور ادراک کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتے ہیں۔
- شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے سب سے بڑے حامی اور اس کے روح رواں ہیں۔
- جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی زیرنگرانی شائع ہونے والا رسالہ 'شب خون' نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔
- شب خون کے ساتھ ساتھ کلام حیدری کے ادارت میں نکلنے والا رسالہ 'آہنگ' نے بھی جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔
- جدیدیت ڈارون، نطشے، فرائڈ، مارکس اور آئن اسٹائن وغیرہ مغربی ادیبوں کے زیر اثر پروان چڑھی۔

جدیدیت اور اردو شاعری

- جدیدیت کے زیر اثر اردو شاعری کے موضوع، اسلوب اور ہیئت تینوں سطح پر واضح تبدیلیاں آئی تھیں۔
- ہیئت میں نیاپن لانے کے لیے آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل اور نثری غزل کے امکانات پر غور کیا گیا تھا۔
- جدیدیت پسند شاعروں نے موسیٰ وطور، مریم وعیسیٰ، یوسف وزلیخا، شیریں وفرہاد، قفس وآشیاں، کعبہ وکلیسا، صیاد وگلچیں، ساغر ومینا، ساقی ومیخانہ اور واعظ ومحتسب جیسی کثرت سے استعمال ہونے والی کلاسیکی تلمیحوں، اشاروں اور استعاروں سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔
- جدیدیت پسند شاعروں نے شاعری کا رشتہ اپنی دھرتی سے استوار کرتے ہوئے تخلیقی سطح پر ایسی علامتیں اور تلازمے وضع کیے جن میں صداقتوں کے نئے گوشے بھی ضم ہو جائیں اور بیان کی تہہ داری اور پہلوداری بھی موجود رہے۔ سورج، چاند، رات، اندھیرا، اجالا دھوپ، پرچھائیں، دھند، حصار، سمندر، جھیل، دریا، کشتی، بادبان، جزیرہ، شہر، بستی، گھر، مکان، پتھر، ریت، راکھ، درخت، پتا، پھول، تتلی اور مچھلی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جنھیں مختلف معنیٰ میں بالتکرار استعمال کیا گیا ہے۔
- جدیدیت پسند شاعری میں احساس تنہائی اپنے مضمرات کے ساتھ ایک اہم اور کلیدی وصف بن گیا ہے۔
- جدیدیت پسند غزل گوؤں نے زندگی کی بے معنویت اور بے ہمتی، رشتوں کی بے رشتگی، چہروں کی بے چہرگی، مایوسی، خوف، فنا پرستی، لایعنیت، بے وطنی ہجرت، انفعالیت، احتجاج، تشدد، حسرت تعمیر اور اثبات ذات وغیرہ موضوعات کو اپنے غزلوں میں برتا ہے۔
- نظم میں جدید حسیت علی الخصوص احساس تنہائی اپنے تمام مضمرات اور پیچیدگیوں کے ساتھ

جدیدیت کے زیر اثر ہی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

- آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئتوں کو تقویت اور استحکام اور ہیئتی سطح پر اپنی عصری حسیت کا جادو جدیدیت پسند شاعروں نے جگایا ہے۔
- جدیدیت کے زیر اثر احساسِ تنہائی، بے گانگی، اجنبیت، بے سمتیت، لایعنیت اور انفعالیت وغیرہ موضوعات پر مشتمل نظمیں منظرِ عام پر آئی تھیں۔

جدیدیت پسند شعرا

* ندا فاضلی	* شمس الرحمٰن فاروقی	* شکیب جلالی	* محمد علوی
* خورشید احمد جامی	* مظہر امام	* مظفر حنفی	* ناصر کاظمی
* محمد علی اثر	* شہریار	* شاذ تمکنت	* بشیر بدر
* سلیم احمد	* احمد مشتاق	* پروین شاکر	* شہاب جعفری
* نشتر خانقاہی	* پرت پال سنگھ بیتاب	* احمد ندیم قاسمی	* احمد فراز
* پرکاش فکری	* مغنی تبسم	* سلطان اختر	* مخمور سعیدی
* آشفتہ چنگیزی	* شکیب جلالی	* افتخار عارف	* منیر نیازی
* لطف الرحمٰن	* باقر مہدی	* خلیل الرحمٰن اعظمی	* افتخار جالب
* بلراج کومل	* قاضی سلیم	* احمد ہمیش	* اعجاز احمد
* حسن شہر	* زرینہ ثانی	* ساقی فاروقی	* کمار پاشی
* محمد علی اثر	* وزیر آغا		

جدیدیت اور اردو افسانہ

- جدید لکھنے والے فلسفہ وجود کو سب سے موثر قوت تسلیم کرتے ہیں۔
- جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ڈر، خوف، ذہنی انتشار، ہجرت، جلاوطنی، سفر، داخلی و ذہنی کیفیات، کرب، تنہائی، احساس محرومی و مایوسی، احتجاج اور ماضی کی بازیافت اور کھوئے ہوئے انسانوں کی تلاش وغیرہ جیسے موضوعات ہیں۔
- جدید افسانے میں کہانی پلاٹ اور کردار سے انحراف کیا گیا ہے اور آغاز، انجام اور وحدت ثلاثہ اور ربط کو ضروری نہیں سمجھا گیا ہے۔
- جدید افسانے میں زمان و مکاں کا ماورائی تصور اور انسان کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا گیا ہے۔

- جدید افسانے میں زبان کی شکست وریخت، شخصی علامات، ہندی، ریاضیاتی اور علمی اشکال کے استعمال کی کوشش کی گئی ہے۔
- جدید افسانہ انسان کی خارجی زندگی کا سیدھا سادہ بیان نہ ہو کر انسان کے ظاہر و باطن کا امتزاج پیش کرتا ہے۔
- جدید افسانہ سماجی حل پیش نہیں کرتا صرف سماجی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔
- جدید افسانہ مقصدیت کے حصول کو پیش نہیں کرتا ہے۔
- جدید افسانہ سنسنی خیزی پر زور دیتا ہے۔
- جدید افسانے میں نثری لوازم کی بجائے شعری لوازم کی طرف مراجعت کی گئی ہے۔
- جدید افسانے میں حقیقت کو نظر انداز کر کے اس کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔
- جدید افسانے کے لیے ایسا اسلوب منتخب کیا گیا ہے جو داستانوی اور خواب نویسی جیسا ہو۔
- جدید افسانے میں کرداروں کی جگہ الف، ب، ج یا پھر اس کے صفحات، معمر آدمی، سرخ بالوں والا اور نجات دہندہ وغیرہ کا استعمال ملتا ہے۔
- جدید افسانے کی خصوصیات یا رجحانات کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے داستانوی، علامتی اور ابہامی یا تجریدی۔
- بعض ناقدین نے منٹو کے افسانہ پھندنے کو جدید افسانہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔
- بعض ناقدین نے منٹو کے پھندنے کے ساتھ کرشن چندر کے افسانہ 'غالیچہ' کو بھی جدیدیت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے۔

جدید افسانہ نگار

* انور سجاد * بلراج مین را * سریندر پرکاش * احمد ہمیش
* کمار پاشی * بلراج کومل * دیویندر اسر * خالدہ اصغر
* انتظار حسین * غیاث احمد گدی * انور عظیم * جوگیندر پال
* کلام حیدری * قمر احسن * رشید امجد * منظر کاظم
* غلام الثقلین

جدیدیت اور تنقید

- جدیدیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے میں آل احمد سرور کا نام سرفہرست ہے۔

- 'جدیدیت اور ادب پر' آل احمد سرور نے ایک سمینار کرایا تھا۔
- اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد مسعود حسین خان نے رکھی ہے۔
- مسعود حسین خان نے پہلی بار لسانی نقطۂ نظر سے اسلوب شناسی کے اصول اور چند عملی نمونے پیش کیے ہیں۔
- شمیم حنفی کے خیال میں نئی حقیقت پسندی پورے انسان کے بسیط تجربے کو پیش کرتی ہے اور یہی جدیدیت کا اولین مقصد ہے۔

جدیدیت پسند نقاد

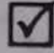
* شمس الرحمٰن فاروقی * گوپی چند نارنگ * مسعود حسین خان * مغنی تبسم
* حامدی کاشمیری * شمیم حنفی * وارث علوی * عالم خوندمیری
* فضیل جعفری * وحید اختر

جدیدیت کے متعلق مختلف ادبا و ناقدین کے آرا و خیالات

- بقول آل احمد سرور جدیدیت آدمی کی تلاش کا نام ہے۔ جدید دور میں یہ کسی بھی آئیڈیالوجی کے خلاف ردعمل ہے۔
- وحید اختر نے جدیدیت کو جدلیاتی مادیت یا ترقی پسندی کی توسیع سے تعبیر کیا ہے۔
- شمس الرحمٰن فاروقی تمام فلسفوں اور نظریوں کی حدود توڑنے کا نام جدیدیت بتاتے ہیں۔
- ڈاکٹر محمد حسن جدیدیت کو رومانیت کی توسیع اور صحت مند جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھتے ہیں۔
- ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا خیال ہے کہ ہر عہد میں جدیدیت کے اپنے معنی ہوتے ہیں اور جو اس دور کے سماجی عمل سے مرتب ہوتے ہیں لہٰذا ہر عہد اپنی مخصوص جدیدیت رکھتا ہے۔
- جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے۔ (وحید اختر: جدیدیت کے بنیادی تصورات)
- جدیدیت سماجی اور میکانکی جبریت کے خلاف ایک باغیانہ ردعمل ہے۔ (لطف الرحمٰن)
- جدیدیت ایک خالص ادبی تحریک سے ایک وسیع اور کشادہ تحریک جس میں سماجی شعور کے علاوہ روانی ارتقا، تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح بھی شامل ہے۔ (وزیر آغا)
- آج کا ادیب کسی نظریے کی غلامی کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔ وہ انسانی زندگی کو آزاد دیکھنے اور برتنے

کا حق مانگتا ہے اور اس کا نام جدیدیت ہے۔ (آل احمد سرور)

- جدیدیت معاصرانہ حقیقتوں میں نئی بصیرت اور معنویت کی تلاش ہے۔ (محمد حسن)
- جدیدیت کسی ایک میلان یا کسی ایک سمت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ کبھی کوئی لاشعور کی حکمرانی کو جدیدیت قرار دیتا ہے تو کبھی وجودیت، شعور کی رو، علامت نگاری اور تجریدیت پسندی کو جدیدیت کہا جاتا ہے۔ (مجنوں گورکھپوری)
- جدیدیت ایک تحریک یا مکتبۂ فکر نہیں بلکہ ایک اضافی قدر ہے نہ یہ ترقی پسندی کی توسیع ہے نہ وجودیت ہی کی تعبیر، نہ رومانیت کی توسیع اور نہ ہی خلاف رومانیت بلکہ آج کے انسان کی ذات اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ (شہزاد منظر)



(13) مابعد جدیدیت

- جدیدیت کے بعد کا دور مابعد جدیدیت کہلاتا ہے۔
- مابعد جدیدیت نہ ترقی پسندی کی ضد ہے اور نہ جدیدیت کی۔
- گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں مابعد جدیدیت کسی ایک وحدانی نظریے کا نام نہیں بلکہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا، جن سب کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی اور معنی پر بیٹھائے ہوئے پہرے یا اندرونی اور بیرونی دی ہوئی لیک کورد کرنا ہے۔
- مابعد جدیدیت تخلیق کی آزادی اور تکثیریت کا فلسفہ ہے جو مرکزیت یا وحدیت یا کلیت پسندی کے مقابلے پر ثقافتی بوقلمونی، مقامیت، تہذیب حوالے اور معنی کے دوسرے پن The other کی تعبیر پر اور اس تعبیر میں قاری کی شرکت پر اصرار کرتا ہے۔
- یاد رہے کہ تکثیریت، بے مرکزیت، بھرپور تخلیقیت، رنگارنگی، بوقلمونی، غیر یکسانیت اور مقامیت، بمقابلہ کلیت پسندی و آمریت مابعد جدیدیت کے نمایاں خصائص ہیں۔
- مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے۔ ہر نظریہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استبدادی ہوتا ہے، اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہے۔
- مابعد جدیدیت ہر طرح کی کلیت پسندی اور فارمولا سازی اور ضابطہ بندی کے خلاف ہے اور اس کے مقابلے پر مخصوص اور مقامی پر نیز کھلے ڈلے فطری بے محابا اور آزادانہ اظہار و عمل پر اصرار کرتی ہے۔
- مابعد جدیدیت ادب فریب معنی کو مسترد کرتا ہے اور متن کی کائنات کو ہی مسلم حقیقت سمجھتا ہے۔
- مابعد جدیدیت متنی تفاعل کو اہمیت دیتی ہے اور متن کو ہی حقیقت جواز حقیقت سمجھتی ہے۔
- مابعد جدیدیت ادب اور فوق ادب کے درمیان کسی طرح کا امتیاز نہیں برتتی
- مابعد جدیدیت ادب کے مطابق اپنے تجربات میں ہم جو بھی معنی با معنی پیکر دیکھتے ہیں وہ فکشن ہیں۔
- مابعد جدیدیت فوق مثبت کو تخلیق کرتی ہے اور ادب میں خواہ وہ شاعری ہو یا فکشن فوق افسانوی (Meta Fictional) پہلو پر اصرار کرتی ہے۔

- مابعد جدیدیت کی ادبی اور ثقافتی اصطلاح حتمی طور پر جدیدیت کے خلاف کسی ردعمل کو سامنے نہیں لاتی بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ جدیدیت کے زیر اثر ابھرنے والے بعض رویوں نے جو ادب تخلیق کیا وہ بھی بعد میں مابعد جدید کہلایا۔ (ابوالکلام قاسمی)
- مابعد جدیدیت میں بین المتونیت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔
- مابعد جدیدیت کے نزدیک متن نہ صرف یہ کہ قائم بالذات ہے اس لیے فی نفسہ اپنا جواز بھی ہے۔
- فکشن نگار بورخیس کے مطابق مابعد جدیدیت ایسا متن تیار کرتی ہے جو ترجیحی طور پر ماقبل کے کسی نہ کسی متن کی تفسیر، اور اس پر تبصرے کی حیثیت رکھتا ہو۔
- مابعد جدید تصور ادب مقامیت اور تہذیبی حوالے کو 'متن کا لازمی سرچشمہ' قرار دیتا ہے۔
- بقول قاضی افضال حسین پیروڈی مابعد جدید افسانہ کی بنیادی صفت ہے۔
- متن کی Self Reflexivity مابعد جدید تنقیدی تصور ہے۔
- ماعبد جدید افسانے کا پورا رویہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا عکاس ہے۔
- مابعد جدید افسانے کی ابتدا 1970ء کے آس پاس ہوئی تھی۔
- بالعموم مابعد جدید مفکرین کا رویہ ہے:

"If marx isn't true, then nothing is"

مابعد جدید مفکرین کا کلیت پسندی، مرکزیت یا سسٹم کے خلاف ہونا، نیز کثیرالمعنویت، کثیرالوضعیت، مقامیت، بوقلمونی یا سب سے بڑھ کر تخلیقیت پر اصرار کرنا اسی راہ سے ہے۔ (گوپی چند نارنگ)

- مابعد جدیدیت پر مغربی ادیبوں میں سے سوسیئر، وٹگنسٹائن، لاکاں، رولاں بارتھ، میشیل فوکو اور ژاک دریدا وغیرہ نے سب سے زیادہ اثر ڈالا۔
- گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا مابعد جدیدیت کے سب سے بڑا حمایتی ہیں۔
- فضیل جعفری مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ کے سخت مخالف رہے ہیں۔
- گوپی چند نارنگ کی کتاب 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' مابعد جدید تنقیدی تصورات کا مستند اور جامع تعارف پیش کرتی ہے۔
- مابعد جدیدیت کا سہ روزہ کل ہند سب سے پہلا سمینار مارچ 1997ء میں دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں گوپی چند نارنگ نے منعقد کرایا تھا۔

مابعد جدیدیت سے وابستہ ناول نگار

* الیاس احمد گدی * عبدالصمد * حسین الحق * مشرف عالم ذوقی
* سید محمد اشرف * صلاح الدین پرویز * علی امام نقوی * سلیم شہزاد
* شموئل احمد * عشرت ظفر * جتیندر بلو * غضنفر
* احمد داؤد * اطہر نیاز * انور سین رائے * ظفر پیامی
* اکرام اللہ

مابعد جدیدیت سے وابستہ افسانہ نگار

* غیاث احمد گدی * انور خان * سلام بن رزاق * انور قمر
* خالد جاوید * ساجد رشید * طارق چھتاری * سید محمد اشرف
* رضا امام * ابن کنول * مقدر حمید * م ناگ

مابعد جدیدیت سے وابستہ تنقید نگار

* گوپی چند نارنگ * وزیر آغا * نظام صدیقی * فہیم اعظمی
* حامدی کاشمیری * قمر جمیل * ضمیر بدایونی * قاضی افضال حسین
* ابوالکلام قاسمی * آصف فرخی * انیس اشفاق * عقیل احمد
* خورشید احمد



Unit-10

اردو کی دیگر شعری اور نثری اصناف اور ہیئتیں

رباعی

- رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔
- رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'چار چار' کے ہیں۔
- اصطلاحاً رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور تیسرا مصرع بے قافیہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ تیسرے مصرع میں بھی قافیہ ہو سکتا ہے۔ (اس میں کوئی خرابی نہیں۔ میر نے خود چاروں مصرعوں میں قافیہ استعمال کیا ہے)

غفلت میں گزاری زندگانی ہم نے | یاروں کی کوئی بات نہ مانی ہم نے
ہے وقت تو اک نعمت عظمیٰ آزاد | قدر اس کی مگر کبھی نہ جانی ہم نے

(فضل حق آزاد)

تجھ مکھ کا یہ پھول ہے چمن کی زینت | تجھ شمع کا شعلہ ہے دکن کی زینت
فردوس میں نرگس نے اشارہ سوں کہا | یہ نور ہے عالم کے نین کی زینت

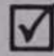
(ولی)

- رباعی میں بیان کیا جانے والا مضمون اچھوتا، پیش کیا جانے والا خیال بلند اور انداز بیان دل کش ہونا چاہیے۔
- ضروری ہے کہ رباعی کا چوتھا یعنی آخری مصرع زیادہ پُرزور ہو اور محسوس ہو کہ رباعی کا پورا مضمون اس میں سمٹ آیا ہے۔
- رباعی میں عام طور پر اخلاق و تصوف، پند و موعظت اور حکمت وغیرہ کے مضامین ہوتے ہیں۔
- رباعی کے موضوعات مقرر نہیں ہر نوع کے خیال کو رباعی میں سمویا جا سکتا ہے۔
- ارباب عروض نے رباعی کو رباعی کے علاوہ ترانے، دوبیتی، چہار مصرعی، خفتی اور رخصی لکھا ہے۔
- یاد رہے کہ رباعی میں قطعہ کے برخلاف صرف دو شعر یا چار مصرعے ہی ہو سکتے ہیں۔
- رباعی کے لیے صرف ایک بحر اور 24 اوزان مختص ہیں۔ صرف اسی بحر اور انھیں اوزان میں رباعی کہی جا سکتی ہے۔
- رباعی کے لیے صرف ایک بحر 'بحر ہزج' مختص ہے۔
- بحر ہزج میں جو چار مصرعے بہ طور رباعی کہے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک مصرعہ چار ارکان پر

مشتمل ہوتا ہے۔ چاروں ارکان میں استعمال ہونے والی ماتراؤں کی تعداد بیس ہوتی ہے۔

- یادرہے کہ یہاں ماترا سے مراد یہ ہے کہ اگر رباعی کے کسی بھی مصرعے کی تقطیع کی جائے تو اس میں قابل شمار حرف تعداد میں بیس ہوتے ہیں۔
- پروفیسر خواجہ کرام الدین کے مطابق اردو کے پہلے رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔(اردو کی شعری اصناف صفحہ 98)
- نورالحسن نقوی کے مطابق دکنی شاعر میر عبدالقادر نے 1700ء میں اردو کی پہلی رباعی کہی تھی۔ (تاریخ ادب اردو صفحہ 48)
- رباعی میں قافیہ کی ترتیب حسب ذیل ہوتی ہے بطور مثال:

الف	الف
ب	الف



قطعہ

- قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جو مضمونِ واحد پر مشتمل ہو اور اس کا پہلا شعر غزل اور قصیدے کی طرح مطلع نہ ہو بلکہ صرف ہر شعر کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوں یعنی قطعہ کا پہلا اور دوسرا مصرع ہم قافیہ یا ہم ردیف نہ ہو بلکہ صرف دوسرا مصرعہ، چوتھا مصرعہ، چھٹا مصرعہ ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوں علیٰ ہذاالقیاس۔
- قطعہ میں کم سے کم دو شعر ہوتے ہیں اور زیادہ کی کوئی تعداد متعین نہیں۔
- قطعہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہر طرح کے موضوعات میں سما سکتے ہیں۔
- قطعے کی ہیئت غزل اور قصیدہ سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہے۔
- قطعہ کے لیے کسی بحر یا وزن کی تخصیص نہیں البتہ رباعی کی مخصوص بحر سے اس کا منفرد ہونا ضروری ہے۔
- قطعہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تمام اشعار آپس میں مربوط اور معنوی اعتبار سے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں یعنی ایک بیت کا تعلق دوسری بیت سے ہو۔
- مثال کے طور پر قافیہ کی ترتیب قطعہ میں حسب ذیل ہوتی ہے:

الف	ب
ج	ب

د

ب

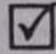
علی ہذاالقیاس

- قطعہ کی مثال:

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے　　اسے بازوے حیدر بھی عطا کر

(اقبال)

- قطعہ بعض اوقات غزلوں اور قصیدوں میں بھی واقع ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر عموماً قطعہ کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان 'ق' یا قطعہ لکھ دیا جاتا ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ یہاں سے قطعہ شروع ہوتا ہے۔



شہر آشوب

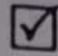
- شہر آشوب نظم کی ایسی صنف جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر کسی شہر یا ملک کے بگڑتے حالات، ابتری، بدامنی، بدنظمی، انتشار و کرب اور اقدار کی شکست و ریخت کا بیان ہزلیہ، طنزیہ یا ہجویہ انداز میں ہو۔
- شہر آشوب کے لیے کوئی مخصوص ہیئت متعین نہیں یہ عموماً مخمس، مسدس، قطعہ، رباعی، مثنوی اور قصیدے کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔
- شہر آشوب ابتداءً ایسے قطعوں یا رباعیوں کا مجموعہ ہوتی تھی جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے حسن و جمال اور ان کی دل کش اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔
- شہر آشوب کی مثال:

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے　　رکھیں وہ فوج جو موتی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے　　سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

- اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل سے اردو میں شہر آشوب کی روایت شروع ہوئی تھی۔
- اردو میں پہلا شہر آشوب لکھنے والا شاعر جعفر زٹلی ہے۔
- نوکری نامہ جعفر زٹلی کا مشہور شہر آشوب ہے جس میں 125 اشعار ہیں۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ شہر آشوب ان اصناف سخن میں سے ایک ہے جن کی شناخت ہیئت سے نہیں بلکہ

- یاد رہے کہ شہر آشوب ان اصناف سخن میں سے ایک ہے جن کی شناخت ہیئت سے نہیں بلکہ موضوع سے ہوتی ہے۔



ریختی

- ریختی وہ صنف سخن ہے جس میں عورتوں کے جذبات کا اظہار خود عورتوں کی زبان، محاورے اور روزمرہ میں کی جاتی ہے۔
- ریختی میں صنف نازک کو عاشق اور مرد کو معشوق کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- چونکہ ریختی میں عورتوں کی جنسی خواہشات کو بہت بے تاب اور بے باک انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس لیے ریختی اردو شاعری کی بدنام ترین صنف کہلاتا ہے۔
- ریختی بھی ایسی صنف سخن ہے جس کی شناخت ہیئت سے نہیں بلکہ موضوع سے ہوتی ہے۔
- ریختی کی ایک مثال

مجھے کہتی ہیں باجی نے تاکا اپنے دیور کو
نہیں دبنے کی میں بھی گر نہیں تاکا تو اب تاکا

- محمد حسین آزاد کے مطابق ریختی کے موجد سعادت یار خان رنگین ہیں جیسا کہ انھوں نے آب حیات میں لکھا ہے کہ:

"ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خان رنگین کا ایجاد ہے۔"

(آبِ حیات: از محمد حسین آزاد ص، 359)

- راقم الحروف کے خیال سے ریختی کے موجد ہاشمی بیجاپوری ہیں اور باقاعدہ موجد سعادت یار خان رنگین ہیں یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریختی کے موجد ہاشمی بیجاپوری ہیں اور شمال میں ریختی کے موجد سعادت یار خان رنگین ہیں جیسا کہ اس کی تائید نصیر الدین ہاشمی کے اس بیان سے ہوتی ہے:

"اگرچہ ریختی کی ابتدا دکن سے ہوئی مگر ریختی نام یہاں نہیں رکھا گیا یہ نام لکھنؤ میں رکھا گیا۔ بہرحال ہاشمی بیجاپوری کو اس قسم کی شاعری کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔"

(مضمون: حیدرآباد کا ایک قدیم شاعر محمد صدیق قیس، مشمولہ نیا دور جنوری 1961)

- یاد رہے کہ یو.جی.سی بھی ریختی کا موجد ہاشمی بیجاپوری کو ہی مانتی ہے۔

ریختی کے اہم شعرا: ہاشمی، سید محمد قادر خاکی، رنگین، انشا، امجد علی نسبت، مرزا علی بیگ نازنین اور

خانم جان۔

- ریختی عام طور پر غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے لیکن اس کا انداز، طرزِ لہجہ حتیٰ کہ زبان و بیان غزل سے قطعاً مختلف بلکہ متضاد ہوتا ہے۔
- بعض شعرا نے مستزاد کی ہیئت میں بھی ریختی لکھی ہے۔



واسوخت

- واسوخت ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں محبوب کو جلی کٹی سنا کر کسی اور سے دل لگانے کی بات کہی جاتی ہے۔
- یا واسوخت وہ صنفِ سخن ہے جس میں شاعر محبوب کے ظلم و ستم، بے التفاتی اور بے اعتنائی سے تنگ آکر ردِعمل کے طور پر 'یارِ دیگر' کی تعریف و توصیف اور حسن و جمال کی مدح سرائی کرتے ہوئے اس سے دل لگانے کی بات کرتا ہے۔
- واسوخت کے اشعار عام طور سے مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ کے ہیئتوں میں لکھے جاتے ہیں۔
- واسوخت معاملہ بندی کی ایک شاخ ہے۔
- واسوخت بھی ایسی صنفِ سخن ہے جس کی شناخت، ہیئت سے نہیں بلکہ موضوع سے ہوتی ہے۔

واسوخت کی مثال:

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے ۔۔۔ بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
ہاں جو جفا بھی آپ نے قاعدے سے کی ۔۔۔ ہاں ہم ہی کاربند اصولِ وفا نہ تھے
لب پر ہے تلخیٔ مئے ایام ورنہ فیض ۔۔۔ ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

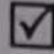
- واسوخت فارسی سے اردو میں آئی ہے۔
- فارسی میں واسوخت کا موجد وحشی یزدی ہے (شبلی کے مطابق)
- محمد حسین آزاد نے اردو میں واسوخت کا موجد میر تقی میر کو قرار دیا ہے جیسا کہ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ:

> "اہلِ تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انھیں (میر تقی میر) کو واسوخت کا موجب تسلیم کیا ہے۔" (آبِ حیات ص ۱۹۹)

- محمد حسین آزاد سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے میر کے بجا آبرو کو واسوخت کا

موجد قرار دیا ہے۔

- واسوخت کے اہم شعرا: میر، آبرو، جرأت، شوق، امانت
- لکھنؤ میں واسوخت کو سب سے زیادہ فروغ امانت نے دیا تھا۔



تضمین

- تضمین سے مراد ہے اپنے یا کسی دوسرے شاعر کے مصرعے یا شعر پر مصرعہ یا مصرعے لگانا۔
- تضمین کی متعدد صورتیں ہیں جیسے ایک مصرعہ پر ایک مصرع لگانا، ایک شعر پر ایک مصرع لگا کر مثلث کرنا، مطلع پر مطلع لگانا، شعر پر تین مصرعے لگا کر مخمس کرنا، شعر پر چار مصرعے لگا کر مسدس کرنا یا کئی شعر لگا کر قطعہ بند کرنا۔

حالی کا شعر ہے:

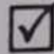
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں　　　دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

داؤد عباسی نے اس پر تین مصرعے لگا کر مخمس کی شکل دے دی۔

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں　　　پہلے یہ دیکھیے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں

سن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں　　　ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

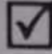


مستزاد

- مستزاد کا مطلب ہے زیادہ کرنا یا اضافہ کرنا۔
- اصطلاح میں مستزاد اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرعے کے بعد ایک موزوں فقرہ بڑھا دیا جائے۔
- جو فقرہ بڑھایا جاتا ہے اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ جس مصرع پر بڑھایا جائے اسی کے وزن میں ہو۔
- عام طور سے فقرہ کا اضافہ رباعی یا غزل کے مصرعوں پر کرتے ہیں۔
- مستزاد کی دو قسمیں ہیں: (1) مستزاد عارض (2) مستزاد لازم
- مستزاد عارض وہ ہے کہ جو فقرہ زیادہ کیا جائے اس کا مضمون شعر کا جز و نہ ہو۔

- مستزاد لازم وہ ہے کہ جو فقرہ زیادہ کیا جائے اس کا مضمون شعر کے مضمون سے پیوست ہو۔
- مستزاد کی مثال:

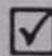
میں ہوں عاشق، مجھے غم کھانے سے انکار نہیں   کہ ہے غم میری غذا
تو ہے معشوق، تجھے غم سے سروکار نہیں   کھائے غم تیری بلا



مثلث

- مثلث اس نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند تین مصرعوں پر مشتمل ہو۔
- مثلث کے پہلے بند کے تینوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اس کے بعد ہر بند کے پہلے دو مصرعے کسی اور قافیہ یا قافیہ وردیف میں ہوتے ہیں لیکن ہر بند کا تیسرا مصرع پہلے بند کے قافیہ (یا قافیہ وردیف) کا پابند ہوتا ہے۔
- مثال کے طور پر مثلث کے دو بند ملاحظہ ہوں:

شفق کی چھاؤں میں چرواہا جب بنسی بجاتا ہے   تصور میں مرے ماضی کے نقشے کھینچ لاتا ہے
نظر میں ایک بھولا بسرا عالم لہلہاتا ہے
مرے افکار طفلی کو ہے نسبت اس کے نغموں سے   میں بچپن میں کیا کرتا تھا الفت اس کے نغموں سے
جبھی بنسی کی لے میں عہد طفلی جھلملاتا ہے



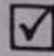
مربع

- مربع ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں چار چار مصرعے ہوں۔
- عام طور سے مربع کے پہلے بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہر بند کے تین مصرعوں میں جداگانہ قافیہ ہوتا ہے۔ صرف چوتھے مصرعے میں پہلے بند کے قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔
- مربع کبھی کبھی پہلے بند کا آخری مصرع بالکل اسی طرح ہر بند کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔
- مربع کی مثال:

مرثیہ ایسا ہے تو نے یہ کہا   جس سے حاصل ہو دو جگ کا مرتبا

تجھ کو بخشادیں گے شاہِ تاجدار
ہے یقین دل پر مرے روز جزا

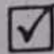
- مربع کے ہر بند میں چار مصرعے ہوتے ہیں اور رباعی میں بھی چار مصرعے ہوتے ہیں لیکن دونوں میں نمایاں فرق ہے۔
- مربع اور رباعی میں پہلا فرق یہ ہے کہ رباعی میں تیسرے اور مربع میں چوتھے مصرعے کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔
- مربع کے پہلے بند کے چاروں مصرعے بالعموم ہم قافیہ ہوتے ہیں۔
- رباعی کے برخلاف مربع کے لیے کوئی بحر مختص نہیں جبکہ رباعی کے لیے بحر ہزج مختص ہے۔



مخمس

- مخمس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں پانچ پانچ مصرعے ہوں۔
- مخمس کے پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہر بند کے پہلے چار مصرعے کسی اور قافیہ میں ہوتے ہیں لیکن ہر بند کا پانچواں مصرع پہلے بند کے قافیہ کا پابند ہوتا ہے۔
- مخمس میں کبھی کبھی ایک ہی مصرعے ہر بند کے آخر میں یعنی پانچویں مصرعے کے طور پر دہرایا جاتا ہے۔
- مثال کے طور پر ایک مخمس کا آخری بند ملاحظہ ہو:

دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ
ازبس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار



مسدس

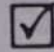
- مسدس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں چھ چھ مصرعے ہوں۔
- مسدس کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ باقی دو مصرعے یعنی پانچواں اور چھٹا مصرع اپنا الگ قافیہ یا قافیہ و ردیف رکھتے ہیں۔

یعنی مسدس کے چھ مصرعوں میں سے پہلے چار مصرعے ایک قافیہ میں ہوتے ہیں اور باقی دو

مصرعے ایک الگ قافیہ میں ہوتے ہیں:

- مسدس کی مثال:

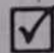
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے   نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے   میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو



مثمن

- مثمن ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں آٹھ مصرعے ہوں۔
- مثمن کے پہلے بند کے تمام مصرعوں کا ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا ضروری ہے۔
- پہلے بند کے بعد کے ہر بند کے پہلے سات اور بعض صورتوں میں چھ مصرعے الگ قافیے میں ہوتے ہیں اور آخر کے ایک یا دو مصرعے پہلے بند کے قافیہ و ردیف کے پابند ہوتے ہیں۔
- مثمن کی مثال:

اے چارہ گر آ چک کہ آدم چارہ گری ہے   میں جان سے جاتا ہوں، تجھ بے خبری ہے
کیوں پہلے ہی درماں سے یقین بے اثری ہے   اپنی سی تو کر دیکھ عبثِ نسخہ دری ہے
ہو جاؤں میں جاں برتو تری نام وری ہے   یوں دعویِ بے صرفہ تو بیہودہ سری ہے
گر ہم سے مریضوں کی دوا ہووے تو جانیں
بیمارِ محبت کو شفا ہووے تو جانیں



مُسَمَّط

- مسمط تسمیط سے مشتق ہے اس کے لغوی معنی موتی پرونے کے ہیں۔
- مسمط اس نظم کو کہتے ہیں جس میں متعدد بند اور ہر بند میں متعدد مصرعے ہوتے ہیں۔
- مسمط کی شکل مربع، مخمس، مسدس، مثمن کوئی بھی ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں ہر بند کے مصرعے سوائے مصرع آخر کے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور ہر بند کا آخری ایک یا آخری

دو مصرعے قافیے میں پہلے بند کے مصرع آخر کے تابع ہوں۔

- مسمط کی مثال:

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گل رو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل پھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں، رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم منھ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی



گیت

- گیت کے معنی 'گایا ہوا' اور 'گان' ہیں۔ یعنی جو گایا جا سکے اسے گیت کہتے ہیں۔
- گیت شاعری کی وہ صنف ہے جس میں موسیقیت یعنی نغمگی کی فراوانی ہوتی ہے اور اس میں شخصی جذبات یا دلی کیفیات سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ بلفظ دیگر گیت میں شاعر یا فرد کی ذاتی زندگی کے احساسات و تجربات ہوتے ہیں جو نرم، سبک، شیریں اور مترنم الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں۔
- گیت ڈاکٹر قیصر جہاں کے الفاظ میں ''ایک موڈ، ایک خیال اور ایک احساس کا بھرپور اظہار ہے۔ اس میں زندگی کے کسی واقعے کی تفصیل نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص واقعے سے پیدا شدہ تاثرات کی جھلک ہوتی ہے۔''
- غزل اور رباعی کی طرح گیت بھی داخلی صنف سخن ہے۔
- گیت کسی بھی بحر میں لکھا جا سکتا ہے لیکن عموماً چھوٹی بحریں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔

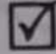
گیت کی مثالیں:

جو مورے سیاں کو گرمی لگے ندی، نالا، تلیا ہوجاؤں
جو مورے سیاں کو سردی لگے سال دو سالہ، رجیا ہوجاؤں

(واجد علی شاہ)

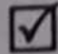
- گیت کی کئی قسمیں ہیں: جیسے لطیف گیت، کلاسیکی گیت، پاپ گیت یا پھر لوک گیت۔
- اردو میں گیت کی روایت امیر خسرو کے عہد سے مانی جاتی ہے۔

- امیر خسرو نے راگ راگنیوں کے ساتھ گیت کو پروان چڑھانے کے لیے راگوں کا ایجاد بھی کیا تھا۔
- گیت نگار شعرا: امیر خسرو، میرابائی، کبیر، قلی قطب شاہ، وجہی، علی عادل شاہ، ولی، افضل جھنجھانوی، عزلت، شاہ آیت اللہ جوہری، شیخ جیون، نیاز بریلوی، بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ، آغا حسن امانت، آغا حشر، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، ساغر نظامی، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، جاں نثار اختر، مسعود حسین خان، جمیل الدین عالی، ندا فاضلی اور جاوید اختر۔



چہار بیت

- چہار بیت گروپ مقابلے میں گائے جانے والی صنف ہے جسے اکھاڑہ یا دنگل کہتے ہیں۔ دو گروہ کے مقابلے میں پر جوش سوال و جواب کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ دونوں گروپ کا ایک خلیفہ اور استاد ہوتا ہے اور استاد فن لکھ کر دیتا ہے اور خلیفہ اپنے ہم نوا کے ساتھ اس فن کو دنگل میں پیش کرتا ہے۔ سبھوں کے ہاتھ میں دف ہوتا ہے۔
- چہار بیت کی صنف ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے مسمط، مربع اور مستزاد کے ساتھ مذہبی، اخلاقی، تاریخی، سماجی، قومی و وطنی، احتجاجی و سیاسی اور تقریباتی و عشقیہ میں لکھے جاتے ہیں۔
- چار بیت کا لفظی معنی چار شعر ہوتا ہے لیکن اس کی تخلیق میں اس کے لفظی معنی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ یہ فن مثلث، مثنوی یا مستزاد کی ہیئت میں پیش کیا جاتا ہے۔
- مولانا عرشی چہار بیتوں کو پٹھانوں کے لوک گیت کہتے ہیں۔
- چہار بیت کی صنف ہندوستان کے لوک گیتوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔
- چہار بیت قوالی کے انداز پیش کش سے زیادہ قریب ہے۔
- چہار بیت کو پٹھان راگ کہا جاتا ہے۔
- چہار بیت فارسی سے ماخوذ ہے۔
- چہار بیت کی ایجاد افغانستان کے سرحدی پٹھانوں نے کی تھی۔
- چہار بیت کی ابتدا ہندوستان میں رام پور کے عبدالکریم خان غزنوی نے کی تھی۔



ہائیکو

- ہائیکو ایک قدیم جاپانی صنف ہے جس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں۔
- ہائیکو کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے تینوں مصرعوں کے جملہ ارکان سترہ ہوں۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہائیکو کی بناوٹ پانچ، سات اور پانچ کے وزن پر قائم ہوتی ہے یعنی اس نظم کے تینوں مصرعوں میں پہلا مصرع پانچ کے وزن پر، دوسرا مصرع سات کے وزن پر اور تیسرا مصرع پانچ کے وزن پر قائم ہوتا ہے۔ جسے ہائیکو کے عروضی ارکان کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فع

- ہائیکو میں موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ ہائیکو میں عام طور پر مناظر فطرت کے مشاہدات و تجربات نقل کیے جاتے رہے ہیں۔ اب اردو میں حمدیں اور نعتیں بھی ہائیکو میں کہی جانے لگی ہیں۔
- جاپانی ہائیکو کی طرح اردو ہائیکو میں بھی عنوانات قائم کرنے کا رجحان عام ہے۔
- ہائیکو اپنی بناوٹ یعنی ہیئت کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہے۔
- ہائیکو کی مثال

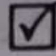
وہ اتنا رویا

انساں تو خیر انساں ہے

پتھر بھی پگھلا

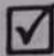
- ہائیکو کو پہلے جاپانی میں ہائی کائی یا ہوکی کہا جاتا تھا۔
- اردو میں یہ تکونی نظمیں یعنی ہائیکو پہلے ثلاثی یا تثلیث کے نام سے جانا جاتا تھا۔
- جاپان میں ہائیکو کا موجد تاکاہاما کوشی کو مانا جاتا ہے۔
- اردو شاعری میں ہائیکو کا موجد نادم بلخی کو مانا جاتا ہے۔
- ہائیکو کے اہم شاعر: نادم بلخی، کرامت علی کرامت، علیم صبا نویدی، مناظر عاشق ہرگانوی، ناوک حمزہ پوری، نذیر فتح پوری، کاوش پرتاپ گڑھی، محسن بھوپالی، ادا جعفری، حمایت علی شاعر، شبنم رومانی، سہیل غازی پوری اور نصیر احمد ناصر۔
- جاپانی شاہی کی صنف ہائیکو سے اردو ادب کو سب سے پہلے شاہد احمد دہلوی نے اپنے رسالہ

'ساقی' کے جاپانی ادب نمبر مطبوعہ 1936ء میں تعارف کرایا تھا۔



ترائیلے

- ترائیلے آٹھ مصرعوں پر مشتمل ایک فرانسیسی صنف سخن ہے جس میں کوئی ایک خیال یا ایک تجربہ لطیف ورنگین شعری سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔
- ترائیلے کے آٹھ مصرعوں میں پہلا تیسرا اور پانچواں مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔
- ترائیلے کا دوسرا اور چھٹا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہوتا ہے مگر پہلے، تیسرے اور پانچویں مصرعوں کے قافیوں سے الگ ہوتا ہے۔
- ترائیلے کا پہلا، چوتھا اور ساتواں مصرعہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرا اور آٹھواں مصرعہ بھی ایک ہی ہوتا ہے مگر پہلے یکساں مصرعوں سے مختلف۔
- اردو کے پہلے ترائیلہ نگار عطا محمد شعلہ نے لکھا ہے کہ'' تری اولے (ترائیلے) فرانسیسی شاعری کا ایک سانچہ ہے جس میں پانچ مصرعوں کے الٹ پھیر سے آٹھ مصرعے بنائے جاتے ہیں گویا ایک طرح کا قطعہ ہے۔
- فرانسیسی شاعری میں ترائیلے کا موجد اڈنس لے رائے کو قرار دیا جاتا ہے۔
- پیٹرک کیرے نے 1651ء میں انگریزی میں پہلی بار ترائیلے کا تجربہ کیا تھا۔
- مظہر امام کے مطابق اردو میں سب سے پہلا ترائیلے نگار عطا محمد شعلہ ہے جس کے ترائیلے 1946 کے اوائل میں نیا دور بنگلور میں شائع ہوئے تھے۔
- اردو کے ترائیلے نگار: عطا محمد شعلہ، احمد ندیم قاسمی، مظہر امام، نریش کمار، ناوک حمزہ پوری، سلیم انصاری، انور مینائی، رؤف خیر اور حنیف کیفی۔



ثلاثی

- ثلاثی ہائیکو سے ماخوذ صنف نظم ہے جس میں محض تین مصرعے ہوتے ہیں۔
- ہائیکو کے مختلف مصرعوں کے ارکان مقرر ہوتے ہیں لیکن ثلاثی میں ایسی قید نہیں۔ اس کے تینوں مصرعے برابر ہوتے ہیں۔

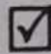
- ثلاثی اور مثلث میں یہ فرق ہے کہ مثلث میں ایک بند تین مصرعوں کا ہوتا ہے لیکن پوری نظم میں ایسے کئی بند ہوتے ہیں۔ ثلاثی میں محض تین مصرعوں میں بات پوری ہو جاتی ہے۔
- پاکستان کے حمایت علی شاعر اس صنف کی ایجاد کے مدعی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام 'مٹی کا قرض' میں تقریباً 32 ثلاثی ہیں۔ ثلاثی کی مثال ملاحظہ ہو:

دو پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں
ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے
سرحدوں سے لپٹ کر روتے ہیں
(قمر اقبال)



تبصرہ

- تبصرہ کے لغوی معنی تشریح، توضیح، تفصیل اور بصارت کے اظہار کے ہیں۔
- کسی کتاب یا رسالے وغیرہ کو پڑھ کر اس کی خوبی یا خامی کے بارے میں رائے دینا تبصرہ کہلاتا ہے۔
- یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تبصرہ اس مختصر نوشتہ کا نام ہے جو کسی کتاب کو عام قاری سے متعارف کرانے کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔



رپورتاژ

- کسی واقعے کی خبر یا رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ اس میں افسانے کا انداز پیدا ہو جائے یا اس میں مصنف کی شخصیت کی جھلک اٹھے تو ا ے رپورتاژ کہتے ہیں۔
- رپورتاژ انگریزی میں 'رپورٹ اَیج' کہتے ہیں۔ رپورتاژ اسی لفظ کا فرانسیسی تلفظ ہے۔
- سردار جعفری نے رپورتاژ کو صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی کہا ہے۔
- پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ ہم رپورتاژ کو واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔
- رپورتاژ اور روداد میں فرق یہ ہے کہ کسی جلسے، محفل، کانفرنس، سمپوزیم اور مشاعرہ یا اس نوعیت کی دیگر تقاریب کی مکمل کارروائی قلم بند کی جائے تو اسے روداد کہتے ہیں لیکن کوئی ادیب اسی تفصیل کو ادبی چاشنی کے ساتھ چشم دید واقعات کے طور پر شخصی تاثرات شامل کر کے پوری دلچسپی پیدا کرتے

ہوئے بیان کرے تو اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔

- ترقی پسند تحریک کے عروج کے ساتھ رپورتاژ نے ترقی کی تھی۔
- حمید اختر رپورتاژ کے موجد قرار دیے جاتے ہیں۔
- حمید اختر نے سب سے پہلے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی روداد ادبی زبان اور محاکاتی انداز میں پیش کر کے اردو داں حلقے کو رپورتاژ سے روشناس کیا تھا۔
- اہم رپورتاژ نگار: حمید اختر، سجاد ظہیر (یادیں 1940)، کرشن چندر، (پودے 1945)، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، شاہد احمد دہلوی، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس۔

پیروڈی

- پیروڈی لفظ پیروڈیا سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔
- اصطلاح میں پیروڈی سے وہ صنف ظرافت (نظم ونثر) مراد ہے جو کسی کے طرزِ نگارش کی طرز اور نقل میں لکھی گئی ہو اور اصل نگارش کے الفاظ و خیالات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ مزاحیہ تاثرات پیدا ہو جائیں۔
- بقول نورالحسن نقوی پیروڈی کو ہماری زبان میں 'تحریف' کہتے ہیں اور تحریف کے معنی الٹنے کے ہیں۔
- تحریف سے مراد یہ ہے کہ کسی تصنیف کی اس طرح نقل کی جائے کہ اس کی شکل تو برقرار رہے لیکن الفاظ میں اس طرح ردوبدل ہو کہ اس سے ہنسی آئے۔
- بقول خواجہ اکرام الدین پیروڈی یا تحریف کسی شعری ونثری تحریروں کی ایسی نقالی کو کہتے ہیں جس سے بنیادی فن پارے کی تضحیک ہو سکے۔
- پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس نظم ونثر کی پیروڈی ہو وہ قاری اور سامع کے درمیان مشہور و معروف ہو تا کہ قاری فوراً پہچان لے اور اس سے بھرپور حظ اٹھا سکے۔
- پیروڈی نظم اور نثر دونوں میں ہو سکتی ہے۔
- پیروڈی میں بعض اوقات صرف ایک لفظ بدل دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک حرف یا حرکت کی تبدیلی سے بھی پیروڈی ہو جاتی ہے۔
- پیروڈی کو مضحکہ خیز لفظی تصرف یا لفظی نقالی بھی کہہ سکتے ہیں۔
- بقول وزیر آغا اردو میں پیروڈی کی روایت کو فروغ دینے والے اکبرالہ آبادی ہیں۔
- اہم پیروڈی لکھنے والے: اکبرالہ آبادی، رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، مولانا جنونی، کنہیالال

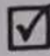
کپور، سید محمد جعفری، پطرس بخاری، احمد جمال پاشا، دلاور فگار، رضا نقوی واہی، اسرار جامعی، پاپولر میرٹھی اور فرقت کاکوروی۔

- اردو نثر میں چند پیروڈی کی مثالیں: چراغ حسن حسرت کی 'پنجاب کا جغرافیہ'، ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب'، 'شفیق الرحمٰن کی 'تزک نادری'، 'احمد جمال پاشا کی 'کپور کا فن'، کنہیالال کپور کی 'غالب جدید شعرا کی محفل میں' اور 'حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں'
- اردو شاعری میں پیروڈی کی مثال۔ ابن انشا کی مشہور غزل ملاحظہ ہو:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا — کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر — جنگل ترے، پربت ترے بستی ترا صحرا ترا
اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹی محفلیں — ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا

ابن انشا کی اس غزل کی سعدیہ حریم نے پیروڈی کی ہے:

کل رات نکلی تھی پولس شب بھر کیا پیچھا ترا — معلوم تھا سب کو مگر پکڑا نہ پر سایہ ترا
دھندہ کرے کوئی تو کیا ہر شے پر ہے قبضہ ترا — دفتر ترے، افسر ترے، موٹر تری بنگلہ ترا
اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوئیں محفلیں — ہر شخص کرتا ہے طلب بھولا ہوا قرضہ ترا



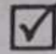
ذرائع ابلاغ

ریڈیو فیچر

- فیچر ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے جس میں کسی ادارے، شے یا فرد پر ضروری روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا ہے۔
- فیچر میں تحقیقی مواد سے تازہ اعداد وشمار، حقائق ان کے ثبوت و حوالہ جات کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔
- اختصار یعنی جامعیت فیچر کی روح ہے۔
- فیچر کے لیے موضوعات کا کوئی تعین نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کسی بھی موجود شے پر فیچر لکھا جاسکتا ہے۔
- ریڈیو فیچر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ریڈیو ٹاک اور ریڈیو ڈرامے کی ملی جلی شکل ہے۔ اس میں ٹاک کی طرح بیانیہ بھی ہوتا ہے اور ڈرامائی صورت حال بھی لیکن ڈرامے میں افسانہ ہوتا ہے اس میں حقیقت۔
- ریڈیو ٹاک میں ایک شخص بیانیہ کے انداز میں کسی موضوع پر بولتا ہے۔ اسے پیش کرنے کے لیے زبان پر قدرت اور آواز و ادائیگی پر قابو ہونا چاہیے۔ اس میں بولنے والا اپنے سامعین سے جو سامنے نہیں ہوتے فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔
- اکثر فیچر اور ڈاکومنٹری ساتھ ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ناقدین اس میں کوئی فرق نہیں مانتے ہیں۔
- ہربرٹ میکلش کا خیال ہے کہ ڈاکومنٹری مکمل طور پر حقائق پر منحصر ہوتی ہے جب کہ فیچر میں اس کے موضوع کی بہتر وضاحت و پیش کش کے لیے حقائق کے ساتھ ساتھ لوک گیت، شاعری اور افسانے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔
- ڈاکومنٹری ہی کی طرح فیچر کا موضوع بھی وسیع ہوتا ہے اس کے موضوع کی وسعت اور تنوع کے تحت دنیا میں موجود چھوٹی سے چھوٹی اور بڑے سے بڑی ہر چیز کو فیچر کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔
- فیچر ایک ایسی آزاد ہیئت ہے جس میں کسی موضوع کا مکمل احاطہ کیا جاتا ہے، بجائے اس کے کہ اس

کی چند خصوصیات بیان کر دی جائیں۔

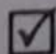
- فیچر میں تازگی کا عنصر لازمی ہے یعنی کسی بھی قدیم موضوع کو نیا زاویہ دے کر اس کو نئی زندگی بخشی جا سکتی ہے۔
- فیچر میں موضوع کے ساتھ ساتھ سرخی کو بھی دل چسپ ہونا چاہیے۔
- فیچر کی زبان سادہ رواں اور آسان ہونی چاہیے جو زیادہ سے زیادہ سامعین کی سمجھ میں آ جائے۔
- فیچر کے اعداد و شمار میں غلطی نہیں ہونی چاہیے، جملوں میں ابہام یا الجھاؤ نہیں ہونا چاہیے اور تکنیکی اصطلاحات سے پرہیز کرنا چاہیے۔
- دل چسپی کے لیے فیچر میں چھوٹے قصے یا لطیفے بیان ہو سکتے ہیں اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔
- فیچر کے اختتام کو دل چسپ ہونا چاہیے بلکہ فیچر ابتدا سے انتہا تک لطیف، دل چسپ، خوشگوار اور رواں ہو تو سامعین کی پوری توجہ حاصل کرتا ہے۔



اداریہ نگاری

- اداریہ کے معنی ہیں اخبار کے ایڈیٹر کا اپنا خاص مضمون، مقالہ، اختتامیہ، ایڈیٹوریل، آرٹیکل (فیروز اللغات کے مطابق)
- اداریہ اخبار کی وہ اہم تحریر ہوتی ہے جس میں مدیر، ناشر یا مالک کسی اہم مسئلے پر رائے دیتا ہے۔
- اداریہ کو اخبار کی جان، اخبار کی ضمیر، واقعات پر روشنی ڈالنے والی مشعل اور ایک ایسا ہتھیار کہا جاتا ہے جس سے سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے کئی شعبوں میں انقلاب لایا جاتا ہے۔
- اداریہ سے اخبار کی بے باکی، احساسات اور پالیسی کا اظہار ہوتا ہے جو کہ اخبار کے کردار کا تعین کرتا ہے۔
- اداریہ میں اہم خبروں کا تجزیہ، کسی مسئلے پر روشنی، کئی معاملات کی توثیق اور کئی واقعات کی تفسیر و توضیح ہو سکتی ہے۔
- اداریہ میں کسی فیصلے کی اہمیت بتائی جاتی ہے اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا مفہوم سمجھایا جاتا ہے۔ وہ بھی مدیر یا اخبار کی رائے کے بغیر۔

- اداریہ میں کسی تجویز کا خیر مقدم کیا جاسکتا ہے، ملک یا سماج کے لیے غیر مفید منصوبے کی مذمت کی جاسکتی ہے، کسی مسئلے پر سوالات کیے جاسکتے ہیں، کوئی خاص رویہ اختیار کرنے کی سفارش کی جاسکتی ہے اور اس میں تمام جائز مطابات کیے جاسکتے ہیں۔
- اداریہ اخبار کے پاس ایسا حربہ ہے جس کے صحیح استعمال سے زندگی کے ہر شعبے کی نگرانی ہوسکتی ہے اور سماج کے صحت مند عناصر کے فروغ میں مدد دی جاسکتی ہے۔
- ضروری ہے کہ اداریہ اس طرح تیار کیا گیا ہو جسے پڑھ کر قاری یہ محسوس کرے کہ کسی معاملے کی پوری نوعیت اس کی سمجھ میں آگئی۔
- ضروری ہے کہ اداریہ کے ذریعے مدیر نہ صرف حقائق کو پیش کرے بلکہ حقائق پر جواں مردی سے تنقید بھی کرے اور قارئین کی صحیح رہ نمائی بھی مگر اپنے نظریات ان پر تھوپنے کی کوشش نہ کرے۔
- اداریہ عام قاری کے بجائے باشعور، حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے اور کسی مسئلے کے پس منظر سے واقفیت کی خواہش رکھنے والے قاری کو پیش نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے۔
- اداریہ کے لیے ضروری ہے کہ اداریہ نگار کا اپنا ایک نصب العین ہو اور ادارتی تحریر کا اہم عنصر استدلال ہو۔
- اداریہ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں رائے عامہ کو متاثر کرنے کی وقت اور صحیح رہ نمائی کی اہلیت ہو۔
- اداریے کی سرخی جاذب، ابتدائی جملے دل کش، زبان سیدھی سادھی، عام فہم اور اسلوب پاکیزہ ہونا چاہیے۔
- اداریے کے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں زیادہ لوگوں کی دل چسپی ہو۔
- اداریہ نگاری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی نظریے، کسی موضوع یا کسی رخ کی ہمیشہ کی تائید یا حمایت ہی کرتا رہے۔ اس کی رائے اور پالیسی میں تبدیلی آسکتی ہے۔
- اداریئے میں ہمیشہ 'ہم'، 'ہماری رائے'، 'ہمارے خیال میں'، جیسے الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔
- اداریہ کسی فرد کا تحریر کیا ہوا ہو یا ادارتی عملے کا اس میں لفظ ہم ہی استعمال ہوگا۔ اسے صحافتی اصطلاح میں 'ایڈیٹوریل وی' کہتے ہیں۔
- اداریے عموماً تین طرح کے ہوتے ہیں (1) اطلاعاتی (2) تاثر قائم کرنے والے (3) مسرت بخش
- اداریے اسلوب کے لحاظ سے بیانیہ، تشریحی یا منطقی ہوسکتے ہیں۔
- اداریے موضوعات کے اعتبار سے سیاسی، سماجی، اقتصادی یا سائنسی ہوسکتے ہیں۔



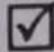
کالم نگاری

- بقول اقبال قادری ''مجموعی طور پر کالم'' ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملہ کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔
- کالم کا اسلوب شگفتہ اور انداز غیر رسمی ہوتا ہے۔
- کالم کے لیے موضوع کی قید نہیں، دنیا کے چھوٹے بڑے کسی بھی موضوع پر کالم لکھا جا سکتا ہے۔
- کالم کی تحریر عام تحریر سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کالم کے اسلوب میں مزاج کا چٹخارہ اور زبان و بیان میں شوخی ہو تو بہتر ہے۔
- کالم نگار اپنے کالم میں ذاتی خیالات کا برملا اظہار کر سکتا ہے۔
- کالم میں 'ہم' کے بجائے 'میں'، 'میرے'، 'میری'، 'میرے خیال میں'، 'میری رائے میں'
- اداریئے میں لطیفے، چٹکلے، پھبتی، قصے اور کہانی سے عموماً پرہیز کیا جاتا ہے جبکہ کالم کو یہی چیزیں کالم بناتی ہیں۔
- کالم انفرادی صحافت کا نمونہ ہے۔
- کالم اور اداریہ میں فرق یہ ہے کہ کالم زیادہ شگفتہ ہلکے پھلکے اور غیر رسمی ہوتے ہیں۔ جبکہ اداریہ بھاری بھرکم سنجیدہ اور مدلل ہوتا ہے۔
- اداریے کے ساتھ اداریہ نگار کا نام نہیں دیا جاتا۔ وہ ایک سنجیدہ معیاری، فکر انگیز تحریر لکھ کر بھی گمنام رہتا ہے مگر اس کے برخلاف کالم کے ساتھ کالم نویس کا نام ضرور ہوتا ہے۔
- کالم میں ایک ایک لفظ کی ذے داری کالم نویس کی ہوتی ہے۔
- کالم کی عموماً پانچ اقسام بتائی جاتی ہیں:

(1) رنگ برنگا کالم (2) ذاتی کالم (3) مزاحیہ کالم
(4) سنڈیکیٹ کالم (5) خصوصی کالم

- رنگ برنگا کالم: اس قسم کے کالم میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ کالم نویس کو مکمل آزادی ہوتی ہے وہ ادبی، علمی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی کسی بھی موضوع پر اظہار کر سکتا ہے۔
- رنگ برنگا کالم میں ایک اشاعت میں ایک موضوع پر مکمل روشنی ڈالی جا سکتی ہے یا کئی موضوعات کو سمیٹا جا سکتا ہے۔

- ذاتی کالم: ایسے کالم میں کالم نویس اپنی تمام تر معلومات کی مدد سے مکمل دلائل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں اس کے ذاتی خیالات پر زور ہوتا ہے۔
- مزاحیہ کالم: ایسے کالم میں ہلکے پھلکے انداز میں کوئی مزاحیہ بات پیش کی جاتی ہے۔
- سنڈیکیٹ کالم: خبر رساں ایجنسیوں کی طرح بہت سے ایسے ادارے ہیں جو مختلف قسم کے اخباری مواد خصوصاً مستقل کالموں کے لیے مضامین، خاکے، نقشے، معمے، کالم، مشورہ کالم، ہلکے پھلکے مضامین، چٹکلے، گھریلو نسخے اور تبصرے وغیرہ اخباروں کو قیمتاً مہیا کراتے ہیں۔ یہ ادارے سنڈیکیٹ کہلاتے ہیں۔ لہٰذا بہت سے کالم نویس اپنے کالم ان اداروں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ سنڈیکیٹ ادارے انھیں ضرورت مند اخباروں کو فروخت کرتے ہیں۔ ایسے کالم سنڈیکیٹ کالم کہلاتے ہیں۔ ان میں کسی کا نام نہیں ہوتا۔
- خصوصی کالم: کسی خاص موضوع جیسے فلم، کھیل کود، سائنس کی دنیا، ماحولیات، طب وغیرہ پر لکھے کالم خصوصی کالم کہلاتے ہیں۔



منظر نامہ (Script Writing)

- اسکرپٹ ایک ایسی تحریر ہے جس کے اندر مختلف خیالی یا حقیقی واقعات کی سلسلہ وار تفصیلات مع آوازی و تصوری اجزا کے درج ہوتی ہیں اور جس میں اس میدان کی قبول کردہ یا منظور شدہ اصطلاحات، مخففات وہیئت کو استعمال کیا جاتا ہے۔
- اصطلاحات، مخففات اور ہیئت اسکرپٹ تحریر کرنے کا وہ تکنیکی طریقہ ہے جو اسکرپٹ کو ریکارڈ کرنے کے لائق بناتا ہے اور اسکرپٹ کو ریکارڈ کرتے وقت ان کا استعمال ہوتا ہے۔
- اسکرپٹ کی وضاحت وصراحت کے لیے اکثر 'بلو پرنٹ'، 'فریم ورک' یا 'ڈھانچے' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔
- کامیاب اسکرپٹ سے مراد وہ اسکرپٹ ہے جسے خریدار موکل یا پروڈیوسر پسند کرلے اور جو ڈائرکٹر کے لیے قابل قبول ہو۔
- اسکرپٹ نگاری کے لیے پانچ چیزوں کی اہلیت وضرورت ہوتی ہے:

(1) ریسرچ کی ضرورت

(2) ڈھانچہ بنانا

(3) Concept کو سوچ لینے کی اہلیت

(4) Visualization بصری پیکر میں سوچنے یا پیش کرنے کی اہلیت

(5) مکالمے اور بیانیہ لکھنے کا ملکہ

- اسکرپٹ کے بنیادی طور پر تین حصے ہوتے ہیں:

(1) سین کا عنوان (Scene Heading) اس کے تحت سین کا مقام اور وقت ظاہر کیا جاتا ہے۔

(2) سین کا بیان (Scene discription) اس میں Visual کی حرکات کا مختصر مگر جامع بیان آواز اور تجویز کی گئی موسیقی کے ساتھ ہوتا ہے۔

(3) مکالمے اور بیانیہ (Dialogue and Naration) اس کے تحت تمام بولے جانے والے الفاظ آجاتے ہیں خواہ وہ کرداروں کے ذریعے ادا کیے جائیں یا راوی کے۔

- یوں تو اسکرپٹ کی کئی ہیئتیں ہیں لیکن بنیادی طور پر دو ہیئتیں زیادہ مقبول اور مروج ہیں:

(1) دو کالمی ہیئت (2) اسکرین پلے ہیئت

- دوسری ہیئتیں جیسے اسٹوری بورڈ اور ڈاکومنٹری اسکرپٹ وغیرہ۔

- دو کالمی ہیئت: دو کالمی ہیئت میں کاغذ کو اوپر سے نیچے دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں:

- دو کالمی ہیئت میں پروگرام سے متعلق بصری نشانات (Video or Picture) بائیں کالم میں اور آڈیو (Audio) یعنی سنائی دینے والی چیزیں داہنے کالم میں درج ہوتی ہیں (اردو چونکہ داہنی طرف سے لکھی جاتی ہے لہٰذا اس میں یہ ترتیب الٹ جائے گی)

- دو کالمی ہیئت میں بصری حصے کی تفصیل کے وافر جگہ ہوتی ہے اور ساتھ ہی مکالمے یا بیانیے کے لیے بھی بآسانی جگہ نکل آتی ہے۔

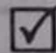
- دو کالمی ہیئت خصوصاً ان پروگراموں کے لیے بہت موزوں ہے جن میں کئی کیمرے ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ کیمرے کے ایک دو تین کر کے نمبر ہوتے ہیں۔ ڈائرکٹر 'ٹیک ون، ٹیک ٹو ٹک تھری کے ذریعے موقع و محل کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دیا جاتا ہے۔ جس کیمرے کا نمبر بولتا ہے وہی کیمرہ کام کرتا ہے۔ ڈائرکٹر اسکرپٹ میں کیمرے کا نمبر سین کے ساتھ درج کرتا جاتا ہے۔

- دو کالمی ہیئت کی کچھ خاص باتیں اس طرح ہیں:

* پورے اسکرپٹ میں صفحہ نمبر دیا جائے۔
* ہر نیا ایکٹ یا سین نئے صفحے سے شروع کیا جائے اور ان کی ابتدا میں لکھا جائے۔

* ایکٹ ایک: سین ایک، یا ایکٹ تین سین دو۔ اسے جلی حروف میں لکھا جائے اور اس کے نیچے لائن کھینچ دی جائے۔
- اسکرین پلے ہیئت: اسکرپٹ کی اس ہیئت میں کاغذ کو کالم میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ سین کی وضاحت پورے کاغذ پر درج کی جاتی ہے۔ مکالمہ یا بیانیہ کاغذ کے وسط میں لکھا جاتا ہے۔
- مزید تفصیلات درج ذیل ہیں:

* اگر سین دوسرے صفحے پر جاری رہتا ہے تو صفحے کے آخری میں 'جاری ہے' لکھنا چاہیے اور نئے صفحے کے اوپری کونے میں بھی 'جاری' لکھنا چاہیے۔
* اگر مکالمہ دوسرے صفحے پر جاتا ہے تو پہلے صفحے پر جملہ مکمل ہو جانا چاہیے اور دوسرے صفحے پر کردار کے نام کے ساتھ 'جاری ہے' درج کرنا چاہیے۔
* نئے ایکٹ اور سین کا نمبر۔ کیمرے کا نیا زاویہ، نیا شارٹ، خصوصی اثرات کو ظاہر کرنے والے الفاظ اور سین میں ہدایات دینے والی اصطلاحیں جیسے 'کٹ' اور 'ڈیزالو' کو جلی حروف میں ہونا چاہیے۔
* کرداروں کے ناموں کو بھی جلی حروف سے نمایاں کرنا چاہیے۔ کچھ اسکرپٹ نگار صرف ابتدا میں ہی کرداروں کے ناموں کو جلی کرتے ہیں مگر بعض حضرات ہر جگہ جلی کرتے ہیں۔ دونوں طریقے مروج ہیں:
* صفحے کے داہنی طرف ڈیڑھ انچ اور بائیں طرف ایک انچ کا حاشیہ ہونا چاہیے۔
* مکالمے اور بیانیے صفحے کے وسط میں آئیں اس کے لیے داہنی طرف تین انچ اور بائیں طرف دو انچ کی جگہ چھوڑی جائے۔
* اس ہیئت میں کردار کا نام مکالمے کے اوپر صفحے کے وسط میں آتا ہے اس کے لیے داہنی طرف سے چار انچ جگہ چھوڑ کر لکھنا چاہیے۔
* صفحے کے اوپر اور نیچے بھی ایک ایک انچ کا حاشیہ ہونا چاہیے۔
* صفحہ نمبر اوپر سے آدھا انچ اور بائیں طرف سے ایک انچ چھوڑ کر لکھنا چاہیے۔



ڈاکومنٹری

- رابرٹ ایل ہیرالڈ کے مطابق ڈاکومنٹری ایسی تخلیق ہے جس میں کسی مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہو کہ دیکھنے اور سننے والے اس سے متاثر ہو کر اس مسئلے کے حل کے لیے عملاً اٹھ کھڑے ہوں۔
- ڈاکومنٹری براہِ راست نہ خبر ہوتی ہے نہ انٹرویو نہ مذاکرہ البتہ یہ چیزیں اس میں کہیں نہ کہیں

موجود ضرور ہوتی ہیں۔

- کچھ ناقدین ڈاکومنٹری کو خبریں اور اطلاعات پہنچانے کا بہترین فن تصور کرتے ہیں لیکن ڈاکومنٹری مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نقطۂ نظر بھی پیش کرتی ہے یا اس کا کوئی نہ کوئی مقصد بھی ہوتا ہے۔
- ڈاکومنٹری خیالی باتوں کے بجائے حقیقت اور سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔
- ایک اچھی ڈاکومنٹری کسی شہر علاقے یا ملک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی یہاں تک کہ قانونی ترقی پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔
- ڈاکومنٹری فیچر کی طرح گہری اور محتاط ریسرچ، تجزیے اور تشخیص کا مطالبہ کرتی ہے۔
- ڈاکٹر منٹری فیچر کی طرح ہی خبر، انٹرویو، مباحثہ، ڈرامہ، تقریر اور موسیقی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔
- ڈاکٹر منٹری ڈرامے کی ہیئت میں ہوسکتی ہے مگر اس طرح نہیں جیسے ایک افسانوی ڈرامہ ہوتا ہے بلکہ اسے کسی صورت حال کی معتبر حقیقی پیش کش ہونا چاہیے۔
- ڈاکومنٹری کے لیے بیانیہ ایک لازمی جز ہے۔
- ڈاکومنٹری میں حقیقی اشخاص کے حقیقی الفاظ ہوتے ہیں اگر وہ شخص زندہ نہیں ہے یا اس تک رسائی ممکن نہیں ہے اور اس کی آواز کی ریکارڈنگ بھی نہیں ہے تو اس کی تحریر ڈائری، خطوط یا متحرک وغیر متحرک تصاویر کو شامل کیا جاسکتا ہے پھر واقعات کے پس منظر کی اصل آواز اور ویزوول کو لیا جائے۔
- ڈاکومنٹری میں کسی ایک نظریے پر زور ہوتا ہے مگر مسئلے کے تمام رخوں کو پیش کرنا بہتر ہے۔
- ٹیلی ویژن ڈاکومنٹری میں راوی بہت اہم رول ادا کرتا ہے مگر جب تک وہ کوئی بڑی شخصیت نہ ہو اسے پس پردہ ہی رہنا چاہیے اور ویزوول کی مناسبت سے صرف اس کی آواز آتی رہے۔
- ڈاکومنٹری کا پروڈکشن آسان ہوتا ہے۔ اسے کم سے کم ساز وسامان کے ذریعے پیش کیا جاسکتا ہے۔
- ڈاکومنٹری عموماً 60 منٹ کی ہوتی ہے اور منی ڈاکومنٹری پندرہ سے بیس منٹ کی ہوتی ہے۔
- سوانحی ڈاکومنٹری میں کسی شخص کے حالات زندگی پیش کرتے ہوئے تاریخی ترتیب کو سختی سے ملحوظ رکھنا چاہیے اور اسٹوری صیغۂ ماضی میں ہی بیان ہونی چاہیے خواہ وہ سوانح باحیات ہی کیوں نہ ہو۔
- سوانحی اسٹوری، صاحب سوانح حیات ہو پھر بھی دوسروں کے ذریعے ہی بیان ہونی چاہیے خود اس کی زبانی نہیں۔



فصاحت و بلاغت

- فصاحت سے مراد یہ ہے کہ لفظ یا محاورے یا فقرے کو اس طرح بولا یا لکھا جائے جس طرح مستند اہل زبان لکھتے یا بولتے ہیں۔
- فصاحت کا تصور زیادہ تر سماعی ہے اس کی بنیاد روزمرۂ اہل زبان پر ہے۔
- بقول شمس الرحمٰن فاروقی بلاغت کسی علم کا نام نہیں ہے، بلکہ بلاغت ایک تصور ہے۔ بلاغت اس صورت حال کی تصوراتی شکل کو کہا جاسکتا ہے جو زبان کو حسن اور خوبی کے ساتھ استعمال کرنے سے ظہور میں آتی ہے۔
- بلاغت کے لغوی معنی ہیں ''تیز زبانی''
- کلام میں جن علوم کے ذریعہ بلاغت کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ ان علوم کو علوم بلاغت کہا جاتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں: (1) علم بیان (2) علم بدیع (3) علم عروض (4) علم قافیہ
- علم بیان وہ علم ہے جس میں ان طریقوں اور امکانات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ ایک ہی معنی (یعنی ایک ہی اطلاع یا ایک ہی معلومات یا ایک ہی علم) کو کئی طرح ادا کر سکتے ہیں۔
- علم بدیع وہ علم ہے جس میں الفاظ کے معنوی اور صوری حسن اور ان طریقہ ہائے استعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے کلام کی معنوی یا ظاہری خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔
- علم عروض وہ علم ہے جس میں زبان اور شعر کا مطالعہ ایک مخصوص طریقے سے کیا جاتا ہے۔
- علم قافیہ وہ علم ہے جس میں ان الفاظ کی آپس میں موسیقیاتی ہم آہنگی کا مطالعہ ہوتا ہے جو مصرع کے آخر میں آتے ہیں اور تکرار صورت کے ذریعے شعر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔
- یاد رہے کہ علم بیان کو 'علم ادب' اور 'علم کتابت' بھی کہتے ہیں اسی طرح علم بدیع کو علم معنی بھی کہتے ہیں۔
- علم بیان کے وہ اجزائے ترکیبی جو کسی بھی سادہ بیان کو دل کش اور پر اثر بناتے ہیں (یعنی اس کا رشتہ بلاغت سے جوڑتے ہیں) حسب ذیل ہیں: (1) تشبیہ (2) استعارہ (3) مجاز مرسل (4) کنایہ
- حقیقت: جب کسی لفظ سے اس کے وہی معنی مراد لیے جائیں جس کے لیے اسے وضع کیا گیا ہے تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔
- مجاز: جب کسی لفظ سے حقیقی معنی کے بجائے ایسے معنی مراد لیے جائیں جو لفظ کو لازم تو ہوں لیکن التزام یہ رکھا جائے کہ اس جگہ وہ لازم مراد نہیں تو اس لفظ کو مجاز کہتے ہیں
- تشبیہ: تشبیہ کے معنی ہیں مشابہت۔ جب کسی مشابہت کے باعث ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دیا جائے تو (چاہے اس میں مشابہت کی وجہ کا اظہار ہو یا نہ ہو) تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔
- جس چیز کو تشبیہ دی جائے اسے مشبہ اور جس چیز سے تشبیہ دی جائے اسے 'مشبہ بہٗ' کہتے ہیں۔ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مل کر طرفین تشبیہ کہلاتے ہیں۔
- اس مشترک وصف کو جس کی بنیاد پر تشبیہ دی جاتی ہے وجہ شبہ یا وجہ تشبیہ کہتے ہیں۔ ادوات تشبیہ سے مراد وہ الفاظ ہیں جس کا استعمال ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ تشبیہ دینے میں کیا جاتا ہے۔

- تشبیہ کی مثال:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے   (میر)

اس شعر میں ہستی اور نمائش مشبہ حباب اور سراب مشبہ بہ اور 'سی، سی' ادوات تشبیہ ہیں۔

- **استعارہ:** استعارہ کے لغوی معنی مستعار لینا، ادھار لینا، ہیں۔
- استعارہ مجاز کی ایک قسم ہے۔ جس میں لفظ اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق وسباق کے اعتبار سے نئے معنی مستعار لیتا ہے۔
- یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ استعارہ اسے کہتے ہیں کہ کلام میں مشبہ کو حذف کر کے اس کی جگہ مشبہ بہ کو لایا جائے اور اس سے مشبہ کا ارادہ کیا جائے جیسے سنبل یا سانپ کو ذکر کر کے زلفِ معشوق مراد لیا جائے جیسے:

ہیں یاد وہ بے مثال آنکھیں   کیا ہیں تری او غزال آنکھیں

اس میں شاعر معشوق کا استعارہ غزال سے کیا ہے۔

- یادر ہے کہ تشبیہ اور استعارہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے مانند قرار دیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ قرار دے دیا جاتا ہے مثلاً خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ میں نے پھول جیسی لڑکی دیکھی تو ظاہر ہے یہ تشبیہ ہو گیا گر یوں کہے کہ میں نے پھول دیکھا تو اسے استعارہ کہیں گے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ تشبیہ میں غلو کے ساتھ ایک چیز کو دوسری قرار دینے (مشبہ کو مشبہ بہ قرار دینے) کو استعارہ کہتے ہیں۔
- تشبیہ میں جسے مشبہ کہتے ہیں اس کی جگہ استعارہ میں مستعار لہ ہوتا ہے اور تشبیہ میں جسے مشبہ بہ کہتے ہیں وہ استعارہ میں مستعار منہ بن جاتا ہے۔
- تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مل کر طرفین تشبیہ کہلاتے ہیں۔ تو یہاں مستعار لہ اور مستعار منہ مل کر طرفین استعارہ کا نام پاتے ہیں۔
- **مجاز مرسل:** جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے کسی قرینے کی بنا پر اس کے مجازی معنی میں استعمال کیا جائے اور حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو (مثلاً کل اور جز کا، سبب اور مسبب کا، ظرف اور مظروف کا) تو اسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔
- یادر ہے کہ اگر حقیقی اور مجاز معنی میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہیں گے۔
- مجاز مرسل کی مثال:

جب ہاتھ اس کی نبض پہ رکھا طبیب نے   محسوس یہ کیا کہ بدن میں لگی ہے آگ

اس شعر میں ہاتھ یعنی کل بول کر انگلیاں یعنی جز مراد لیا گیا ہے۔

- **کنایہ:** لغت میں مخفی اشارہ یا پوشیدہ بات کہنے کو کہتے ہیں۔
- علم بیان کی اصطلاح میں کنایہ وہ لفظ ہے۔ جس کے معنی حقیقی مراد نہ ہوں بلکہ معنی غیر حقیقی مراد ہوں اور اگر حقیقی معنی بھی مراد لیے جائیں تو جائز ہو۔
- کنایہ میں ملزوم بول کر لازم مراد لی جاتی ہے۔

- یاد رہے کہ کنایہ کے برخلاف استعارہ میں حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔
- کنایہ کی مثال:

اس چمن میں طائر کم پر اگر میں ہوں تو کیا دور ہے صیاد ابھی اور آشیاں نزدیک ہے (میر)

یہاں کم پر سے کم اڑنے والا مقصود ہے اور اگر اس سے مراد پروں کا مقدار تھوڑا ہونا لیا جائے تو بھی جائز ہے۔

علم بدیع یا علم معنی

- بدیع کے تحت کلام میں لائے گئے تمام خواص کو عام زبان میں 'صنائع اور بدائع' کہتے ہیں۔
- علم بدیع میں کلام میں استعمال ہونے والی صنعتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- کلام میں دل کشی اور رنگینی پیدا کرنے کے مختلف طریقوں کو صنائع (صنعت کی جمع) کہتے ہیں۔ صنعتیں دو طرح کی ہیں: (1) صنائع لفظی (2) صنائع معنوی

صنائع معنوی مندرجہ ذیل ہیں:

ادماج: شعر میں ایسے الفاظ اور ایسی تراکیب کا استعمال کرنا جن سے مجموعی طور پر دو معنی یا دو مفہوم پیدا ہوں جیسے:

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز (غالب)

ایک مفہوم: اگر اس بت سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا مگر ایمان مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے اس بت کی بہ نسبت جان کو عزیز نہیں رکھوں گا۔

دوسرا مفہوم: اس بت سے جان عزیز نہ رکھنا ہی عین ایمان ہے لہٰذا اس سے زیادہ جان عزیز نہیں رکھوں گا۔

- **استتباع:** ممدوح کی تعریف ایسے الفاظ میں کی جائے کہ ایک تعریف سے دوسری تعریف بھی از خود پیدا ہو۔

زیر راں تیرے ہے وہ تو سن چالاک کہ تو چھیڑ دے ایک ذرا اس کو جو وقت صف جنگ
یوں کرے جست کہ جیسے سر میداں نبرد منھ سے اڑ جائے حریفوں کے ترے خوف سے رنگ
(سودا)

پہلے شعر میں ممدوح کے گھوڑے کی تیزی کی تعریف ہے مگر ایسے الفاظ میں کہ جس سے دوسرے شعر میں وہی چیز خود ممدوح کی شجاعت کی مدح ہو جاتی ہے۔

- **استخدام:** شعر میں ایسا لفظ استعمال کرنا جس کے دو معنی ہوں مگر شاعر کی مراد ایک خاص معنی سے ہو لیکن ضمیر کے معنی خیز استعمال کی وجہ سے دوسرے معنی بھی لیے جاسکیں۔
- یاد رہے کہ ایہام میں بھی ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں مگر شک برقرار رہتا ہے۔

کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانی یار کا اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیچ (میر)

اس شعر میں لفظ 'زبان' میں استخدام ہے۔

- **ایراد المثل:** کلام میں کہاوتوں یعنی ضرب الامثال کو نظم کرنا ایراد المثل کہلاتا ہے۔
- اگر کہاوت کسی لفظی تغیر کے بغیر نظم کی جائے تو اسے ارسال المثل کہتے ہیں
- اگر کہاوت کسی لفظی تغیر کے ساتھ نظم کی جائے تو اسے ضرب المثل کہتے ہیں۔

ایہام: ایہام کے لفظی معنی 'وہم میں ڈالنا' کے ہیں۔

- ایہام سے مراد یہ ہے کہ کلام میں کوئی ایسا لفظ لایا جائے جس سے سننے والا تھوڑی دیر کے لیے وہم میں پڑ جائے۔ ایسے لفظ کے عموماً دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک معنی قریب دوسرے معنی بعید۔ سننے والے کا ذہن معنی قریب کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی مراد معنی بعید ہے۔ جیسے:

میکش کو ہوس ایاغ کی ہے　　پروانے کو لو چراغ کی ہے　　(دیا شنکر نسیم)

- 'لو' کے دو معنی ہیں 'شوق و آرزو' اور 'مشغلہ' پہلے معنی بعید ہیں اور دوسرے قریب مگر یہاں یہ لفظ صرف شوق کے معنی میں ہے۔
- **تجاہل عارفانہ:** اس کے لغوی معنی جان بوجھ کر انجان بننے کے ہیں یعنی کسی چیز کی نسبت باوجود علم کے ناواقفیت ظاہر کرنا تاکہ اس کی تعریف میں مبالغہ کیا جا سکے:

لطف اس کے بدن کا کیا کہوں میر　　کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

- **تضاد (طباق):** شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال ایک ساتھ کیا جائے جس میں بہ اعتبار معنی تضاد پایا جائے جیسے آگ اور پانی، عرش اور فرش:

ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں نہ ہونا　　آتا نہیں نظر کچھ جاوے نظر جہاں تک　　(میر)

- **استدراک:** پہلے مصرعے میں کچھ ایسے الفاظ استعمال ہوں کہ پڑھتے وقت ہجو کا گمان ہو، مگر دوسرے مصرعے پر پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہجو نہیں بلکہ مدح ہے۔

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظ میں تو یہ　　نہ اپنا یاد ہے احسان اور کی تقصیر　　(ذوق)

- **تلمیح:** کسی مشہور تاریخی واقعہ، قصہ یا مسئلے کی طرف اشارہ کرنا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

- **تنسیق الصفات:** ممدوح کی صفات کا ذکر ترتیب وار کرنا (یہ صنائع لفظی میں بھی شامل ہے)

خوش خو خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام　　گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام　　(انیس)

بوسہ لیتا ہے جو منہ چڑھ کے برابر گیسو　　کتنا گستاخ ہے بے ہودہ ہے خود سر گیسو

- **حسن تعلیل:** تعلیل کے معنی ہیں 'وجہ متعین کرنا' یا 'وجہ بیان کرنا'۔ اگر کسی چیز کے لیے کوئی ایسی وجہ بیان کی جائے جو چاہے واقعی نہ ہو مگر اس میں کوئی شاعرانہ جدت و نزاکت ہو اور بات واقعہ اور فطرت سے مناسبت بھی رکھتی ہو تو اسے حسن تعلیل کہتے ہیں:

پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات　　یوں بوند بوند اتری ہمارے دلوں میں رات　　(شہریار)

- **سوال و جواب:** شعر میں سوال و جواب کے ذریعے مکالمہ کی صورت پیدا کرنا:

پوچھا کہ طلب، کہا قناعت　　پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت　　(دیا شنکر نسیم)

- **لف و نشر مرتب یا غیر مرتب:** لف و نشر کے لفظی معنی لپیٹنے اور پھیلانے کے ہیں۔
- اصطلاح میں مطلب یہ ہے کہ پہلے چند چیزیں ایک ترتیب سے بیان کی جائیں (اس کو لف کہتے ہیں) اس کے بعد وہی چیزیں ان کے منسوبات اسی ترتیب یا دوسری ترتیب سے پھر بیان کیے جائیں (اس کو 'نشر' کہتے

ہیں)۔ اگر دونوں مصرعوں میں ایک ہی ترتیب ہو تو لف ونشر مرتب کہتے ہیں اور اگر ترتیب ایک نہ ہو تو اسے لف ونشر غیر مرتب کہتے ہیں

آتش و آب و باد و خاک نے لی (1 2 3 4) — وضع سوز و نم و رم و آرام (1 2 3 4)

کبھی جو زلف اٹھاوے تو منہ نظر آوے (1 2) — اسی امید پہ گزری ہے صبح و شام ہمیں (2 1)

- **مبالغہ:** کسی شخص یا چیز کی تعریف یا مذمت اس حد تک کرنا کہ سننے والے کو یہ گمان ہو کہ اس وصف یا ذم کا کوئی اور مرتبہ باقی نہیں رہا:

پہنچے ہم آرزوے وصل میں نزدیک بہ مرگ — سوجھی ہے شکل ملاقات بہت دور ہمیں

- **مراعات النظیر:** اس سے مراد یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ جمع کیے جائیں جن کے معنی میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک نسبت واقع ہو مگر یہ نسبت تضاد اور تقابل کی نہ ہو۔ مراعات النظیر کو تناسب، توفیق، تلفیق بھی کہتے ہیں:

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے — نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

- **مزاوجہ:** اس صنعت میں دو معنی بطور شرط و جزا کے دونوں مصرعوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں اس طور پر کہ جو امر پہلے مصرعے میں بیان کیا جاتا ہے وہ تبدیلِ الفاظ کے ساتھ دوسرے مصرعے میں بیان کیا جاتا ہے:

وہ وصل کا دن کیوں چھوٹا تھا — یہ ہجر کی رات بڑی کیوں ہے (شہریار)

- **مکر شاعرانہ:** کوئی بات ایسی کہی جائے جس کا اصل مقصد کچھ ہو اور ظاہر کچھ اور ہوتا ہو۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں (مومن)

- **ہجو ملیح:** کسی شخص یا چیز کی ہجو ایسے الفاظ میں کرنا جن سے بظاہر کوئی ہجو نہ معلوم ہوتی ہو بلکہ ایک قسم کی تعریف نکلتی ہو۔

صنائع لفظی

- صنائع لفظی سے مراد وہ خوبیاں ہیں جو لفظوں کو خاص رعایتوں اور ہنر مندی کے ساتھ برتنے سے وجود میں آتی ہیں۔
- **تجنیس:** ایسے دو لفظ جو صورت یا تلفظ کے اعتبار سے مشابہ ہوں مگر ان کے معنی مختلف ہوں:

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال — ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال (غالب)

- **تکریر یا تکرار:** دو لفظوں کو، جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں شعر میں یا مصرعوں میں برابر برابر جمع کرنا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی شعر یا مصرعوں میں ایک لفظ کی تکرار کی جائے یعنی بار بار آئے:

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا وحشت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا تہمت ہے

- **قلب:** دو لفظوں کے حروف ترتیب میں یکساں ہوں مگر حروف کی تقدیم و تاخیر میں اس طرح فرق کر دیا جائے کہ جو حرف پہلے لفظ میں مقدم ہو وہ دوسرے لفظ میں موخر ہو:

وصف اس صرصر شیم کا کوئی لکھے یا پڑھے — ذہن دوڑے صورت رفرف چلے فرفر زباں

- **ردالعجز:** دوسرے مصرعے کے دوسرے ٹکڑے کی تکرار کو کہتے ہیں:

خط نامہ بر کو پھیر دیا اور یہ کہا — کہنا کہ ہم نے جان لیا مدعاے خط (نسیم)

- **اشتقاق:** جب کلام میں ایک اصل کے چند لفظ لائے جائیں اوران لفظوں میں اصل لفظ کے حروف کی ترتیب بھی قائم رہے اور اصل میں جو معنی ہیں اس سے بھی موافقت ہو۔

تو میرے حال سے غافل ہے پائے غفلت کیش تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے (ذوق)

- **ایداع:** ممدوح کی تعریف میں ایسے الفاظ لانا کہ ان سے اس کا نام نکل آئے۔

ابو ظفر شہ والا گہر بہادر شاہ سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

- **صنعت عاطلہ:** (غیر منقوط یا مہملہ یا تعطیل): منقوط یا مہملہ یا تعطیل): ایسا کلام، خواہ نظم ہو یا نثر جس میں کوئی حرف نقطہ دار نہ ہو صنعت عاطلہ کہلاتا ہے۔

ہم طالع ہما مراد و ہم رسا ہوا طاؤس کلک مدح اڑا اور ہما ہوا (دبیر)

- **صنعت فوقانیہ:** (فوق النقاط) ایسی عبارت یا نظم لکھنا جس میں جتنے حرف نقطہ دار ہوں یہ سب ایسے ہوں کہ ان میں صرف اوپر او پر نقطہ آئے:

مظہر صدق و صفا قدر شناس مردم معدن عدل و سخا مظہر الطاف و عطا (نظام)

- **صنعت تحتانیہ:** (تحت النقاط): تمام عبارت یا نظم میں حروف منقوط ایسے ہوں جن میں نقطہ نیچے آتا ہو۔ لہٰذا فوق النقاط کی ضد ہے:

مارا جو اسے حیدر کرار کو مارا سردار کو مارا جو علمدار کو مارا (دبیر)

- **رقطا:** کسی عبارت یا نظم یا مصرع یا بیت میں ایک حرف بے نقطہ اور ایک حرف نقطہ دار بالترتیب موجود ہو:

یہ برق کی ہے مثل بہت آب و تاب سے کیا قرب کیا بعید یہ برش عذاب ہے (نسیم)

- **خیفا:** جس شعر یا فقرہ کے ایک لفظ کے کل حروف بغیر نقطوں کے ہوں اور ایک لفظ کے سب حروف نقطہ دار ہوں:

شب کو جشن سرور تخت رہا کار فیض مدار بخت رہا (ذوق)

- **تلمیع:** جب شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں ہو اور دوسرا کسی اور زبان میں:

بہار زندگی برباد کردی قیامت اے دلِ ناشاد کردی

- **ترصیع:** دونوں مصرعوں کے الفاظ علی الترتیب ایک دوسرے کے ہم وزن ہونے کو ترصیع کہتے ہیں:

پوچھا کہ طلب کہا قناعت پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت (نسیم)

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام تیری رفتار قلم جنبشِ بالِ جبریل (غالب)

- **براعت استہلال:** جب کتاب کے شروع میں کسی قصہ یا قصیدے کے ابتدائی اشعار میں ایسے لفظ موجود ہوں جن سے اصل مطلب ظاہر ہو جائے۔
- **توشیح:** ایسے اشعار جن کے مصرعوں کے شروع کے حرفوں سے کوئی نام یا عبارت یا شعر بن جائے۔
- **تنسیق الصفات:** کسی شخص یا کسی چیز کا ذکر اس کی صفات کے ساتھ کیا جائے، خواہ یہ صفات خوبی کی ہوں یا برائی کی۔

ہے ہے مرے سعید و رشید و متیں جواں خوش رو جواں غریب جواں مہ جبین جواں

